اگست 2014، قیمت 10 ₹

BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2014, Vol. 02, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
Date of Publication : 11/07/14
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

اقبال کی کہانی
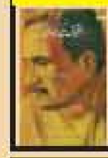
مصنف: جگن ناتھ آزاد
صفحات: 63
قیمت: -/10 روپے

بے زبان ساتھی

مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 64
قیمت: -/13 روپے

ایک نائی اور رنگساز کا قصہ
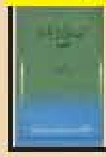
مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 148
قیمت: -/20 روپے

دلچسپ کہانیاں
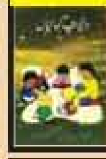
مصنف: رام آسرا راز
صفحات: 188
قیمت: -/22 روپے

چار درویشوں کا قصہ

مرتب: نور الحسن نقوی
صفحات: 96
قیمت: -/16 روپے

ہمارے جاں باز
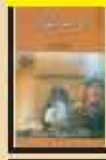
مصنف: پریم پال اشک
صفحات: 168
قیمت: -/24 روپے

بچوں کے حالی
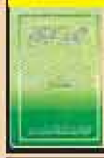
مرتب: صالحہ عابد حسین
صفحات: 63
قیمت: -/14 روپے

نہرو کے ان دیکھے روپ
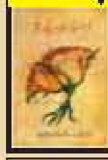
مصنف: بی ڈی ٹنڈن
مترجم: نور الحسن نقوی
صفحات: 219
قیمت: -/23 روپے

رابنسن کروسو

مصنف: ڈینیل ڈیفو، تلخیص: م ندیم
صفحات: 82
قیمت: -/13 روپے

نورجہاں
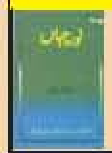
مصنف: ایم آر کوہلی
صفحات: 46
قیمت: -/14 روپے

ہمالیہ کے بنجارے
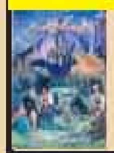
مصنف: شیام سنگھ ششی
مترجم: کمال احمد صدیقی
صفحات: 96
قیمت: -/18 روپے

قصہ شیر کا شکاری کی زبانی

مصنف: اسرار احمد خاں دُرّانی
صفحات: 212
قیمت: -/61 روپے

گاندھی اہنسا کا سپاہی

مصنف: بی ڈی ٹنڈن سدھا کرنی وارشنے
مترجم: محمد حسن قدوائی
صفحات: 144
قیمت: -/21 روپے

مشینی گھوڑا
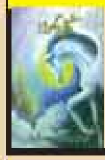
مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 143
قیمت: -/12 روپے

پوربی دیسوں کی کہانیاں
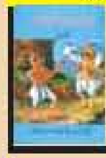
مصنف: کلا جھیروانی
مترجم: عائشہ صدیقی
صفحات: 341
قیمت: -/39 روپے

بچوں کا باغ
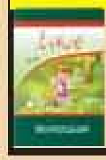
مصنف: ظفر کمالی
صفحات: 64
قیمت: -/24 روپے

گیت گاتے رہو
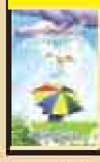
مصنف: شمیم کمالی
صفحات: 65
قیمت: -/14 روپے

بوستاں کی کہانیاں

مرتب: حافظ شبلی
صفحات: 87
قیمت: -/15 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

اس شمارے میں

ماہنامہ بچوں کی دنیا

جلد:2 شمارہ:8 اگست 2014

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
جشن آزادی	یہ ہے میرا ہندوستان	زبیر رضوی	3
	جنگ آزادی اور ترنگا	ثمینہ پروین	4
عید کی یادیں	بوبن بوا کی عید	سراج عظیم	6
کہانی	عید کا چاند	اوصاف نجمی	9
نظم	امتحان کا نتیجہ	محمد وکیل	10
دل چسپ خبریں	دنیا ایک عجائب خانہ	ادارہ	11
نظم	بندر کا ولیمہ	کیفی سنبھلی	15
کہانی	آنچ چھپیں...	مناظر عاشق ہرگانوی	16
لطیفہ کہانی	ایک گونگا تین بہرے	آصف جلیل احمد	18
ہندی کہانی	کھلائی	ڈاکٹر سمیتا چوہدری مترجم انعام تابش	20
مضمون کہانی	اکمل نے نجات پائی	شمس الاسلام فاروقی	24
چھپکلی کی باتیں	دیوار والی	طلحہ نسیم	28
مضمون خاکہ	اونٹ پرندہ	شمیم احمد صدیقی	31
نظم	پیڑ لگائیں	محسن باعشن حسرت	35
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	36
ہماری صحت	ایک گلاس کھانے پینے کی	مصطفیٰ ندیم خاں غوری	41
نانی کا صندوق	اے مرے پیارے وطن	پریم دھون	45
مزیدار کہانی	نواب شجاعت حسین	سید لطف اللہ گورکھپوری	48
قسط وار	فسانۂ عجائب 5	رجب علی بیگ سرور	50
نظم	بچوں کی دنیا: پہلی سالگرہ	نور واحدی	59
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	60
ڈاک خانہ	بڑوں کی باتیں	ادارہ	62
انٹرنیٹ سے	الو کے منتظر	ادارہ	64

مدیر اعلیٰ: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبۂ ادارت: 11-49539009

ای میل

bachonkidunlya @ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت: فون: 26109746

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،

نئی دہلی-110066

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

"بچوں کی دنیا" کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شاخ: 110-7-22، قمر ڈنکوں، ساجدیار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چارمینار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

آپس کی باتیں

پیارے دوستو ہمارے اور آپ کے ایک بزرگ تھے۔ بلکہ بزرگوں کے بھی بزرگ۔ مولوی اسماعیل میرٹھی جو 1844 میں ان دنوں پیدا ہوئے جب دہلی میں غالب اور ذوق کی شہرت آسمان پر تھی۔ بڑے ہوکر مولوی اسماعیل نے بچّوں کو اردو سکھانے کے لیے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ بہت ہی آسان زبان میں۔ یہ کتابیں دیکھنے میں چھوٹی تھیں لیکن ان کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ ہندوستان کی نہ جانے کتنی نسلوں نے صرف ان ہی کتابوں کو پڑھ کر اردو سیکھی ہے۔ اب تک ان کے ہزاروں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ آج بھی یہ ملک میں بہت سی جگہوں پر پڑھائی جا رہی ہیں اور لوگ انھیں پڑھ کر اردو سیکھ رہے ہیں۔ دو صدی پہلے کے اس زمانے میں اردو میں بچوں کے لیے الگ سے لکھنے والے تو ملتے نہیں تھے اس لیے مولوی صاحب کو پرائمری کلاسوں کی ان کتابوں کے لگ بھگ سارے ہی سبق خود لکھنے پڑے۔ اور بھئی کیا سبق انھوں نے لکھے تھے۔ جملے اتنے میٹھے، لفظ اتنے اچھے اور سچے کہ لگتا ہے کسی نے موتی پرودیے ہیں۔ مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ بیسیوں موضوعات پر انھوں نے ایسی پیاری پیاری نظمیں لکھیں کہ آج بھی پرانے لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ ان نظموں کے کتنے ہی شعر اردو بول چال کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایسا ہی ایک شعر ہے:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
وہ ہے خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

سچ پوچھیے تو اس شعر کی وجہ سے ہی آج ان کی یاد آگئی۔ اور یہ شعر ہمیں یاد آیا اِس بات سے کہ اِسی مہینے ہم اپنی آزادی کا 68واں جشن منا رہے ہیں۔ دوستو، ہم چونکہ آزادی ملنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں لہٰذا ہمارے لیے ملک کی آزادی شاید اتنی اہمیت نہ رکھتی ہو جتنی ہمارے آبا واجداد کے لیے رکھتی تھی، جنھوں نے خود غلامی کی ذلّت اُٹھائی تھی اور جن کی سوچ کو مولوی اسماعیل نے ان دو مصرعوں میں بڑی ہی دردمندی کے ساتھ سمو دیا تھا۔ ہندوستان پر انگریز حکومت کا وہ سوڈیڑھ سو سال کا دور اس عظیم الشان ملک کی تاریخ میں سب سے بڑی لعنت بن کر آیا تھا۔ انگریزوں کا اس ملک میں آنے کا مقصد اسے لوٹنا کھسوٹنا اور یہاں کی دولت کو اپنے ملک لے جانا تھا۔ جو بھی ان کے اِس مقصد کی راہ میں آیا اسے انھوں نے بے رحمی سے کچل دیا۔ ٹیپو سلطان، نواب واجد علی شاہ اور رانی لکشمی بائی کی حکومتوں کے خلاف انگریزوں نے جو سازشیں کیں ان سے بددل ہوکر ملک کی تاریخ میں پہلی بار 80 فیصد ہندوؤں نے 20 فیصد مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ایک کمزور مسلم حکمراں بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما چن کر 1857 کی جنگ آزادی لڑی جس میں وہ اپنوں کی ہی سازشوں کی وجہ سے ناکام رہے۔ لاکھوں ہندوستانیوں نے اس لڑائی میں اپنی جان دی۔ بعد میں انگریزوں نے لاکھوں مجاہدوں کو پھانسی پر لٹکا کر انتقام تو لیا ہی، ساتھ میں 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی پر اور سختی سے عمل شروع کر دیا۔ جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بات بے بات جھگڑے کرائے۔ مذہب تعلیم اور زبان کے نام پر نفرت پھیلائی۔ پورے ملک میں ٹیلی گراف اور ریلوں کا جال صرف اس مقصد سے بچھایا تاکہ ایک طرف تو ملک کے ہر حصے پر نظر رکھی جاسکے دوسرے ہندوستان کا مال جتنا زیادہ لوٹا جاسکے لوٹ کر تیزی سے ریل گاڑیوں میں بھر کر بندرگاہوں پر اور وہاں سے انگلستان بھیجا جاسکے۔ ہمارے ہر رسم ورواج اور عقیدے کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، مذاق اڑاتے تھے اور کالا ہندوستانی کہہ کر ہمارے بزرگوں پر پھبتیاں کستے تھے۔ ان کے کلبوں اور ریستورانوں کے باہر لکھا ہوتا تھا 'ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ منع ہے'۔ یہ تھے وہ حالات جن کی ترجمانی مولوی صاحب نے کی تھی اور جنھیں یاد کر کے ہم آزادی کی اصل اہمیت اور ضرورت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لیے دوستو، آپ سبھی کو جشنِ آزادی مبارک! جم کر خوشی منایئے لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ آزادی بڑی قیمتی ہے!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

□ زبیر رضوی

یہ ہے میرا ہندوستان

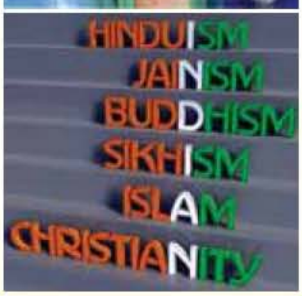

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
ہنستا گاتا، جیون اس کا دھوم مچاتے موسم
گنگا، جمنا کی لہروں میں سات سروں کے سرگم
تاج، ایلورہ جیسے سندر تصویروں کے البم
یہ ہے میرا ہندوستان

دن البیلے اس کے راتیں مستی کی سوداگر
دھرتی جیسے پھوٹ بہی ہو دودھ کی کچی گاگر
اونچے نیچے پربت اس کے نیلے نیلے ساگر
یہ ہے میرا ہندوستان

بادل جھومے، برکھا برسے، پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پھیلے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مسکائے
یہ ہے میرا ہندوستان

رادھا، سیتا، چندر گائے، گائے اندوبال
نینوں میں کاجل کے ڈورے سرخ گلابی گال
زلفوں کی وہ چھایا جیسے شملہ، نینی تال
یہ ہے میرا ہندوستان

ڈھولک جاگی، مہندی لاگی، رنگ رنگیلا ساون
سکھیاں مل مل ہولی کھیلیں، سانوریا کے آنگن
گھونگھٹ میں گوری شرمائے پیا ملن کے کارن
یہ ہے میرا ہندوستان

راجہ، رانی، گڈا گڈی اور پریوں کی کہانی
بچوں کے جھرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
لوری گائے، ماتھا چومے، ممتا کی دیوانی
یہ ہے میرا ہندوستان

البیلا پنجاب ہے اس کا رومانوں کی بستی
صبح بنارس، شام اودھ اور شالامار کی مستی
بمبئی جیسے شہر ہیں اس میں دلّی جیسی بستی
یہ ہے میرا ہندوستان

غالب، اور ٹیگور یہیں کے میرا کالی داس
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتم کو احساس
یہیں کیا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بن باس
یہ ہے میرا ہندوستان

مندر، مسجد ہیں تو کہیں ہیں گرجا اور شوالے
ملاّ، پنڈت، گیتا اور قرآن کے ہیں متوالے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی دیش کے سب رکھوالے
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

Mr Zubair RazviC-2, AB Complex, 179/8, Zakir Nagar New Delhi- 110025

ثمینہ پروین

جنگ آزادی اور ترنگا

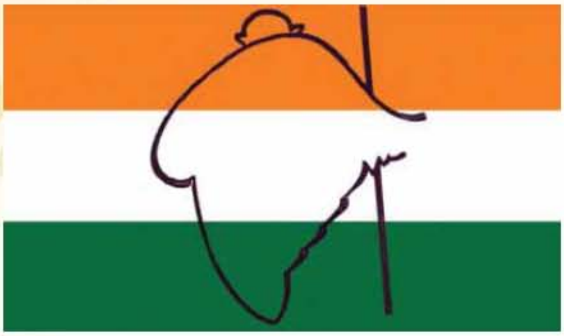

انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان نے کیسے آزادی پائی اس کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ پورے ملک کے پیمانے پر پہلی جنگ آزادی 1857 میں لڑی گئی جس کے دوران مئی سے ستمبر تک دہلی پر ہندوستانیوں کا ہی قبضہ رہا لیکن ہماری نادانیوں اور کچھ مسلم اور ہندو حکمرانوں کی غداری اور انگریزوں کی سازشوں کی وجہ سے یہ جنگ ہماری ناکامی پر ختم ہوئی اور دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کو جو اس جنگ کے رہنما تھے انگریزوں نے مقدمہ چلا کر ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا اور انھیں برما کے شہر رنگون میں ان کی وفات تک قید رکھا گیا۔

اس کے بعد دوسری جنگ آزادی کا دور بال گنگادھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے اور ان سب سے بڑھ کر مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں شروع ہوا۔ لیکن اس بار یہ جنگ توپ تیر تلواروں سے نہیں بلکہ عدم تشدد یعنی اہنسا کے طور طریقے اپنا کر لڑی گئی جو پوری دنیا میں آزادی حاصل کرنے کا اب تک کا سب سے انوکھا اور اپنی طرح کا پہلا تجربہ تھا۔ اس تجربے کے رہنمائے اعظم موہن داس کرم چند گاندھی تھے جنھوں نے خون خرابے کے بغیر ظلم کے خلاف لڑنے اور زندگی گزارنے کے فلسفے کو اہنسا کا نام دیا اور جو اس کا ایک کامیاب تجربہ جنوبی افریقہ کے انگریزوں کی گوری حکومت کے خلاف کر چکے تھے۔ یہ حکومت رنگ کی بنا پر انسانوں میں بھید بھاؤ کرتی تھی۔ اہنسا کے بل پر لڑی گئی اس لڑائی میں وہ جنوبی افریقہ کے کالی رنگت والے عوام کو گوری سرکار سے کئی رعایتیں دلانے میں کامیاب رہے۔

بعد میں ہندوستان آکر انھوں نے اپنے وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے اہنسا کے اصولوں پر ایک نئی جدوجہد شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہاں انھیں تلک اور گوکھلے کی سرپرستی کے علاوہ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا حسرت موہانی کی زبردست حمایت حاصل رہی۔ محمد علی جناح بھی ایک نیشنلسٹ مسلم رہنما کے طور پر ان کا ساتھ دیتے رہے مگر بعد میں الگ ہوگئے۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس نے جو اہنسا میں زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے انگریزوں کے خلاف جنگ کا ایک الگ راستہ اپنا لیا اور ملک سے باہر جا کر انھوں نے آزاد ہند فوج بنائی۔ مگر آخر کار کامیابی اہنسا میں یقین رکھنے والے گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو ہی ملی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا 16 اگست 1947 کو پہلی بار دہلی کے لال قلعے پر محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے ملک کے پہلے وزیر اعظم کے طور پر ترنگا پرچم لہرایا۔

ان سب باتوں کے بارے میں ہم سبھی تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ مثلا کے طور پر نمک آندولن کا خیال گاندھی جی کو امریکی فلاسفر ڈیوڈ تھوریو David Thoreau کی کتاب پڑھتے ہوئے آیا تھا جس نے لکھا تھا کہ ضروری نہیں ہر آدمی ٹیکس دے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں نمک بنانے پر معمولی سا ٹیکس لگا رکھا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم خود نمک بنائیں گے اور ٹیکس نہیں دیں گے۔ اس اپیل کا پورے ملک پر اثر پڑا اور انگریز حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ یہی نہیں بعد میں انھوں نے غیر ملکی سامان نہ خریدنے کی بھی اپیل جاری کردی اور یوں سودیشی کی تحریک ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

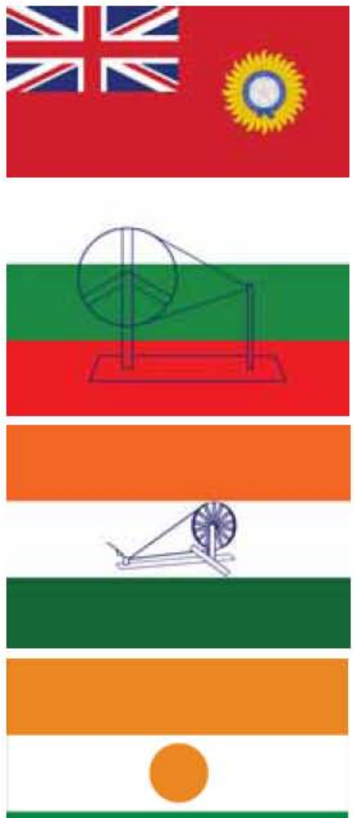

سب سے اوپر ہمارا پہلا ہندوستانی پرچم جو دراصل غلامی کا طوق تھا، نیچے گاندھی جی کا تجویز کردہ پرچم، کانگریس اور نائیجر کے جھنڈے

اسی طرح یہ بھی کم لوگ ہی جانتے ہیں کہ ہندوستان سے باہر ہماری آزادی کا ترنگا پرچم پہلی مرتبہ 22 اگست 1907 کو جرمنی میں میڈم بھیکا جی کاما نے لہرایا تھا جو یہ کارنامہ انجام دینے والی پہلی ہندوستانی تھیں۔ مگر یہ ترنگا ذرا مختلف قسم کا تھا۔ اس کی پہلی پٹی ہرے رنگ کی تھی دوسری سنہری اور سب سے

نیچے سرخ پٹی تھی۔ پرچم پر ہندی میں وندے ماترم لکھا گیا تھا۔

پرچم کی بات چلی ہے تو یہ آج کے بچے شاید نہ جانتے ہوں کہ 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستان کو اس کا پہلا پورے ملک کا پرچم انگریزوں نے دیا جس پر اوپر بائیں جانب انگلینڈ کے پرچم یونین جیک کا نشان تھا اور نیچے بائیں ایک ستارہ۔ یہ سرخ پرچم دراصل ہماری غلامی کا طوق تھا۔ قوم پرست ہندوستانیوں کی طرف سے پہلا قومی پرچم وہی تھا جو بھیکا جی کاما نے لہرایا تھا اور جس میں نیچے ایک سورج اور دوسری طرف چاند بنا کر ہندو مسلم اتحاد دکھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کانگریس میں اسے قبولیت نہیں ملی۔ 1921 میں گاندھی جی نے ایک پرچم تجویز کیا جس میں اوپر سفید، پھر ہری اور نیچے سرخ پٹی تھی اور تینوں پٹیوں پر چرخے کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ یہ بھی قبولیت نہ پا سکا کیونکہ کانگریس کے جس اجلاس میں یہ پیش ہونا تھا وہاں یہ وقت پر پہنچ ہی نہیں سکا۔ آخر 1929 میں کانگریس کے اس ترنگے کو منظوری ملی جس کے بیچ میں چرخا بنا ہوا تھا اور پھر 22 جولائی 1947 کو اسی پرچم میں چرخے کی جگہ اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے چکر کو جگہ دے کر اسے ملک کا قومی پرچم مان لیا گیا جو ہمارا سرکاری پرچم بھی ہے۔ چرخے والا ترنگا عرصے تک کانگریس پارٹی کا پرچم بنا رہا لیکن پارٹی کئی بار تقسیم ہوئی جس کی وجہ سے اب اس پر چرخے کی جگہ ہاتھ کے پنجے نے لے لی ہے۔

ایک دل چسپ بات اور۔ دنیا میں صرف ایک ملک اور ہے جس کا ترنگا ہمارے ترنگے جیسا ہے۔ یہ ہے مسلم ملک نائیجر Niger اور فرق صرف اشوک چکر کی جگہ زعفرانی گولے کا ہے۔ □

Ms Sameena Parveen
DPS Riyadh Saudi Arabia.

سراج عظیم

بوبن بوا کی عید

سب انھیں بوبن بوا کہتے تھے جب بھی صبح تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہوتا اور ہم سب اپنے گھر کے آنگن میں کھیلنے کے لیے جمع ہوتے تو آنگن کے ایک طرف ٹین کے ورانڈے کے پاس ہمارے داد اکی بہن جن کو پورا گھر بوا کہتا تھا اور دادا مُنّی کہا کرتے تھے وہ ایک اور بوا، بوبن بوا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی باتیں کرتی نظر آتیں۔ بوبن بوا پورے محلے میں بوبن بوا کے نام سے ہی جانی جاتی۔ ان کا اصل نام شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ محلے کے گھروں میں وہ زیادہ تر ہمارے یہاں ہی آتیں۔ ہمارا محلّہ بیچ میں تھا۔ ایک جانب ڈاکٹر خان کی خوبصورت نقش ونگار والی لال کوٹھی کے بعد لڑکیوں کا ساہو گوپی ناتھ اسکول اس کے بعد گھنٹہ گھر جہاں سے رمضان کے دنوں میں سحری اور افطار کے لیے سائرن بجتا تھا۔ دوسری طرف مٹھ کی چوکی تھی۔ یہ ہندوؤں کا محلّہ تھا اور بوبن بوا اسی محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں۔

لوگ کہتے تھے بوبن بوا ہندو ہیں مگر ہمیں بوا کی باتوں سے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں۔ کبھی کبھار اگر شام ہوجاتی اور اندھیرا بڑھنے لگتا تو بوبن بوا ہماری مُنّی بوا سے کہتیں ”اچھا مُنّی اب چلوں گی میرے للاّ جی کی پوجا کا بخت ہوت اَئی“ اور یہ کہہ کر چل دیتیں۔ بوبن بوا کی شخصیت پورے محلے کے لیے بڑی پُر اَسرار تھی کیوں کہ ان کے بارے میں لوگوں کو زیادہ معلوم نہیں تھا۔ بس لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ بارہ بنکی کے کسی گاؤں کی رہنے والی تھیں اور بریلی اپنے شوہر کے ساتھ آئیں تھیں۔ ان کے شوہر کی کسی حادثہ میں موت ہوگئی اور پھر وہ کبھی لوٹ کر اپنے گاؤں نہیں جاسکیں۔ بہت سیدھی سادی اور نیک عورت تھیں۔ زیادہ تر ہمارے محلے میں رہتی تھیں۔ ہمارے بڑے سے آنگن میں محلے کے بچے اکٹھا رہتے، بوا اگر موڈ میں ہوتیں تو بچوں کو گھیر کر بیٹھ جاتیں۔ ان سے خوب باتیں کرتیں، کہانیاں سناتیں، کبھی کبھی کوئی دیہاتی گیت بھی خوب تالیاں بجا بجا کر اور لہک لہک کر گاتیں۔ وہ اکثر اپنے ’گھورو‘ بیٹے کا ذکر کرتیں۔ اصل میں یہ گھورو کوئی اور نہیں مُنّی بوا کے بیٹے تھے۔ ہمارے غفور تایا۔

ہمیں ہمیشہ حیرت رہی اور آج بھی ہے کہ ہماری مُنّی بوا جو مسلمان تھیں اور گھر سے زیادہ باہر نکلتی بھی نہیں تھیں ان کی ایک ہندو عورت سے کیسے دوستی ہوگئی کہ دونوں ساتھ کھاتیں، بیٹھتیں اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔ مُنّی بوا کے بڑے بیٹے غفور پاکستان میں رہتے تھے۔ بوبن بوا غفور تایا کو اپنا بیٹا کہتی تھیں۔ اس وقت ہمیں پتہ نہیں تھا بعد میں ہماری بڑی پھوپھی نے ہمیں بتایا کہ جب غفور بھائی ننھے منّے بچے تھے تب ان کو بوا نے دودھ پلایا تھا اور ان کی دیکھ بھال اور پرورش کی تھی کیوں کہ مُنّی بوا ان دنوں بہت بیمار تھیں۔ یہ عجیب کہانی تھی۔ ایک ہندو عورت نے مسلمان بچے کو دودھ پلایا تھا ہمیں بڑی حیرت ہوتی تھی۔ ہمارا معصوم ذہن اس طرح کی باتیں سن کر عجیب کشمکش کا شکار رہتا تھا۔

ہم نے کبھی غفور تایا کو دیکھا نہیں تھا وہ ہمارے بچپن میں ہی پاکستان چلے گئے تھے۔ بوا غفور تایا کو بہت یاد کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے۔ ان کے بچپن کی باتیں کرتیں اور کہتی تھیں ”میرا گھورو بڑا اچھا بچہ اَئی، بھاگ بھاگ کر ہمرا کام کری اَئی، ہمرا بڑا کھیال (خیال) رکھت رائی“ بتاتی تھیں کہ غفور تایا اپنی والدہ مُنّی بوا کے

پاس کم اُن کے پاس زیادہ رہتے تھے۔ "میرا گھورجذی (ضدی) بہت تھا ایک بار جو کہہ دیا تو اُسی پر اڑا رہتا تھا دیوالی پے ضد کر کے پٹاخے اور پھلجڑیاں لاتا تھا مٹھائی، کھیل، بتاشے اور شکر کے کھلونے سب لاتا تھا۔ عید پر مجھ سے بھی کپڑے بنواتا تھا اور مُنّی سے بھی۔ لکھنوا انگرکھا اور پائجامہ اور سر پر دوپلّی ٹوپی لگا کر کیسا اچھا لگتا تھا جیسے نباب (نواب) ہوئی۔" اس طرح کی سیکڑوں باتیں، یاد کرتیں روتیں پھر دعائیں دیتیں۔ "میرا گھورو جہاں بھی ہو سکھ چین سے ہو اور پروالا اس کو سلامت رکھے۔ بس ایک بار آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس کا منہ دیکھ لوں تو چین آجائے۔"

بوبن بوا کو دیکھتے سنتے کافی دن ہو گئے۔ یہ تقریباً سن 1978 کی بات ہے۔ ایک دن بوا بڑی افسردہ اور بے چین سی آئیں، مُنّی بوا سے بولیں "مُنّی ہمرا دل چاہت ائی ہم اپنے گھورو کو کیسو کر کے دیکھ لیئی۔ ہمرا دل اس کے لیے تڑپت رئی، ارے مُنّی اس کی کونوں چٹھی یا کھبر آوت ائی کا..." یہ کہہ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی ساڑی کے پلو سے پوچھنے لگیں۔ ہمیں ان پر بڑا ترس آیا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ بوا غفور تایا سے کس قدر محبت کرتی ہیں۔ مُنّی بوا نے ان کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا "اری بوبن، غفور کا خط آیا ہے وہ خیریت سے ہے اس کو دیکھنے کا تو میرا بھی بہت دل ہو رہا ہے۔ دیکھو اللہ کب ملواتا ہے۔" دونوں بوڑھی عورتیں یہ باتیں کر رہی تھیں اور ہم سوچ رہے تھے غفور تایا اگر آ گئے تو دونوں میں سے کس کے پاس رہیں گے۔

اتفاق سے جب یہ دونوں بوائیں باتیں کر رہی تھیں اس سے اگلے مہینے ہی رمضان تھے۔ آدھے رمضان گزر چکے تھے۔ عید کی آمد آمد تھی ہم سب بچے بھی اپنی عید کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ اچانک الوداع سے ایک روز پہلے غفور تایا بغیر کسی اطلاع کے پاکستان سے آ گئے۔ منی بوا کا تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہمارے گھر کے لوگ بھی خوش تھے۔ لیکن اصلی خوشی بوبن بوا کی تھی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب ان کو پتہ چلا کہ غفور تایا آئے ہیں تو فوراً دوڑتی ہوئی آئیں اور دروازے سے گھستے ہی غفور تایا کو پکارتے ہوئے چپٹ گئیں۔ "میرا بچہ، میرا گھورو، میرا چندا، ارے تو کہاں چلا گیا اپنی مائی کو چھوڑ کر، بیٹا تجھے دیکھنے کو آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میرا للا، اب تو کہیں مت جانا۔ اب تجھے دیکھ لیا، اب ہم آرام سے مر جئی ہیں" یہ کہہ کر بوا ان سے چپٹ کر رونے لگیں۔ غفور تایا فوراً بولے "ارے نہیں مائی تو تو ابھی سو سال اور جیے گی" اور وہ بھی رونے لگے۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی اتنی بوڑھی عورت جس کی عمر تقریباً نوے پچانوے سال کی ہوگی اور تایا بھی تقریباً ستّر برس سے کم نہیں رہے ہوں گے وہ ان سے بالکل چھوٹے بچوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں۔ ہم نے کسی غیر کی اولاد سے اتنی گہری محبت اور انسیت کا منظر پہلی بار دیکھا تھا۔

یہ ایک عجیب رشتہ تھا۔ غفور تایا پاکستان سے سب کے لیے تحفے لائے تھے وہ انھوں نے سب کو بانٹ دیے۔ بوبن بوا کے لیے سفید رنگ کا سوٹ تھا۔ جب وہ ان کو دیا تو بوا بہت خوش ہوئیں کہنے لگیں "ہمرا گھورو لایا ہے عید کے دن ہم پہنیں گے۔" عید کی چاند رات والے دن بوا ایک گٹھری لادے گھر پر آئیں اور غفور تایا کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ گٹھری کھولتے ہوئے بولیں "دیکھ گھورو ہم تہار کے لیے کتنی چیزیں اکٹھا کیے رہن اور کب سے سنبھال سنبھال کر رکھے رہن ...بیٹا جب سے تو گیا رہن کوئی دیوالی، کوئی عید ایسی ناہیں جو ہم تہار لیے کچھ لائے نہ ہوں" گٹھری میں سے انھوں نے پھلجڑیاں، پٹاخے، کرتے پائجامے ٹوپی

تہبند نکال نکال کران کو دیے۔ غفور تایا خاموش تھے۔ صرف آنکھیں برس رہی تھیں۔ آخر رندھے گلے سے بولے "ارے میری مائی... تو اتنا مجھے چاہتی ہے... اتنا یاد کرتی تھی... میں نے تیرا بڑا دل دکھایا... مجھے معاف کر دے" انھوں نے سچ مچ ہاتھ جوڑ لیے۔

"نا میرا بیٹا تو تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اوپر والے سے ہم تہار ملنے کی دعا کرت رہن سو انھوں نے ہماری سن لی اور ملا دیا" ہم سب لوگ یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ ہم چونکہ بہت حساس ہیں اس لیے ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ منّی بوا بھی رو رہی تھیں۔ وہ بولیں "بوبن تو نے تو اپنی محبت اور شرافت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ تو نے وہ کام کیا ہے جو میری سگی بہن نہیں کرتی۔ تو میری سگی بہنوں سے بڑھ کر ہے۔"

دوسرے دن عید تھی غفور تایا نے بوبن بوا کے دیے ہوئے کپڑے پہنے ٹوپی لگائی اور نماز پڑھی۔ ہم لوگ بھی نماز پڑھ کر آئے۔ دیکھا تو بوا غفور تایا کا آڑے پائجامے اور جمپر کا سوٹ پہن کر آئی ہوئی تھیں۔ غفور تایا فوراً بولے "ارے مائی تو تو بالکل فلموں کی ہیروئن لگ رہی ہے۔" بوبن بوا مسکراتے ہوئے بولیں "اے ہٹ نٹ کھٹ تجھے شرم نہیں آت، اپنی مائی سے ایسی مجاک کرت۔" منّی بوا مسکراتے ہوئے بولیں

"اے ہے بوبن کو تو دیکھو ذرا... کیسا اترا رہی ہے۔" گھر کے سارے لوگ ہنسنے لگے۔ اس طرح عید ہنسی خوشی گزر گئی۔ بوا بہت خوش تھیں۔ صبح ہمارے گھر آ جاتیں، تایا کے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں کی اور کیا کیا باتیں کرتی رہتیں۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتیں کبھی ان کے سر میں تیل ملتیں، کبھی ان کے پاس بیٹھتی ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی رہتیں۔

عید کو گزرے ایک ہفتہ ہو گیا تھا ایک دن بوا نہیں آئیں تو تایا ان کو لانے ان کے گھر گئے۔ مگر یہ کیا، تایا تو بوا کو گود میں اٹھائے ہوئے گھر لا رہے تھے۔ تایا کے ساتھ محلے کے بھی کئی لوگ تھے۔ بوا کی آنکھیں بند تھیں۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا اس نے انجکشن وغیرہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد بوا کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھولتے ہی انھوں نے بہت

کمزور سی آواز میں "گھورو" کہا۔ تایا نے فوراً کہا "ہاں مائی اب طبیعت ٹھیک ہے گھبرانا مت۔" بوا نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے گھورو کے سر پر رکھا اور ان کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔

غفور تایا مائی، مائی کر کے زار و قطار رونے لگے۔ منّی بوا بھی روتی جاتیں تھیں اور کہتی جا رہی تھیں۔ "غفور میں جان اٹکی ہوئی تھی۔ اللہ نے بھی اس کے آخری وقت میں غفور سے ملوا دیا۔ جیسے اس کی موت کو غفور سے ملوا دیا۔ جیسے اس کی موت کو غفور کا ہی انتظار ہو۔" سارا گھر افسردہ تھا۔ بوبن بوا کے پڑوس کے ہندو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر تایا نے ارتھی تیار کرائی اور پھر محلے کے لوگ افسردہ دل کے ساتھ بوبن بوا کو شمشان گھاٹ پر جلا آئے۔ پورے محلے میں بوبن بوا کا چرچا تھا۔

دن گزر گئے، عید کو بھی دو مہینے ہو گئے۔ آخر تایا بھی تین مہینے رہ کر پاکستان چلے گئے۔ ان کو وہاں پہنچے ایک ہفتہ ہوا ہوگا کہ پاکستان سے ہمارے ایک رشتہ دار کا فون آیا، غفور بھائی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ یہ بڑی المناک خبر تھی۔ منّی بوا کا رو رو کر برا حال تھا۔ روتی جاتیں اور کہتی جاتیں "شاید اسی لیے عید منانے آیا تھا۔ بوبن بھی مرنے والی تھی اور خود بھی مرنے والا تھا۔" ہمارے محلے کے لوگوں کو پتہ چلا تو وہ بھی منّی بوا کی بات کہنے لگے۔ "بھیا اللہ کی قدرت دیکھو ایک غیر عورت کی محبت اور ممتا کہ اللہ نے دونوں کو مرنے سے پہلے عید کے بہانے ملوا دیا۔" ہماری زندگی میں کئی عیدیں آئی ہیں اور کئی آئیں گی۔ لیکن کبھی کبھی بوبن بوا کی عید بہت یاد آتی ہے! □

Mr Mohd Siraj Azeem
A-47 Zakir Bagh , Okhla Road Jamia Nagar New Delhi-110025

اوصاف مجتبیٰ

عید کا چاند

شعبان کی 30 تاریخ تھی۔ امام صاحب نے مغرب کی نماز پڑھائی اور سب لوگ مسجد کی چھت پر چلے گئے ۔ آخر کار امام صاحب کو چاند نظر آ گیا جس سے سب کے چہرے کھل گئے تھے۔ مگر کوئی تھا جو خوش ہونے کی بجائے اداس تھا اور وہ تھے گڈو میاں۔ ویسے ان کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ سب انھیں گڈو میاں ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ گڈو میاں نے آج تک ایک بھی روزہ نہیں رکھا تھا اس لیے گھر والوں سے کہا تھا کہ اس سال وہ روزہ ضرور رکھیں گے۔

ایک دن صبح سویرے گڈو میاں نے سحری کر لی، لیکن جیسے ہی سورج نکلا، دن چڑھا اور وقت بڑھا گڈو میاں کی حالت بگڑنے لگی۔ کسی طرح عصر کی نماز بھی پڑھ لی۔ اس کے بعد جلدی سے کچن میں

جا کر بیٹھ گئے جہاں افطار کا سامان بن رہا تھا۔ امی نے ڈانٹ کر کہا کہ ''چلو جلدی سے باہر جاؤ اور اندر بیٹھ کر دعا کرو۔''

گڈو میاں نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور خاموشی سے چلے گئے۔ ان کی امی کچھ برتن لینے کے لیے باہر گئیں اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئیں،

لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا کہ سموسے کچھ کم ہو گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

آخر کار افطار کا وقت آ ہی گیا سب لوگ افطار کرنے بیٹھ گئے۔ امّی نے کھجوروں کے ساتھ سموسے بھی گڈو میاں کے آگے رکھ دیے۔ مگر انھوں نے سر ہلا کر سموسوں کی پلیٹ پیچھے سرکا دی۔

''سموسے نہیں کھاؤں گا!'' انھوں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''کیوں نہیں کھاؤ گے؟'' ابّو نے پوچھا۔

''یہ بہت تیکھے بنے ہیں!'' انھوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یہ سنتے ہی سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور گڈو میاں بہت شرمندہ ہوئے ۔ امّی نے پیار سے انھیں گود میں بٹھا لیا اور بولیں، ''ابھی آپ کا جسم اس قابل نہیں ہوا ہے کہ روزے کی سختی سہہ سکے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے سال پہلا روزہ رکھوائیں گے۔ تب تک آپ کا جسم اتنا مضبوط ہو جائے گا روزے کو برداشت کر سکے۔ اور دیکھنا تمھارے پہلے روزے پر انشااللہ کتنی اچھی سی دعوت ہو گی۔''

اس کے بعد گڈو میاں نے افطار تو کر لی لیکن ان کی اداسی اور شرمندگی دور نہ ہوئی۔ تبھی باہر شور ہر اٹھا۔ عید کا چاند ہو گیا ہے۔ بچّوں کی ٹولیاں محلّے میں گھر گھر جا کر سب کو ''چاند کا سلام'' کہتی پھر رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک ٹولی ان کے گھر آئی تب جا کر گڈو میاں کی اداسی دور ہوئی اور وہ دوڑ کر ٹولی میں شامل ہو گئے۔ □

Mr Ausaf Mujtaba Plot No B-6 Afreen Teachers' Colony, Khamgaon Distt Buldhana- 444303 Maharashtra

□ محمد وکیل

امتحان کا نتیجہ ملا ہے

شور برپا ہے بچوں میں تب سے
آگیا ہے 'رزلٹ' آج جب سے
خوش ہیں کہ کامیابی ملی ہے
آرزو کی کلی اب کھلی ہے
یہ جو فیضان چپ چپ کھڑا ہے
فیل ہو کر وہ بے حد ڈرا ہے
شام تک بھی نہ لوٹا وہ گھر جب
فکر ماں باپ کو بھی ہوئی تب
ڈھونڈنے نکلے والد جو گھر سے
تھے اداس اس کے کھونے کے ڈر سے

راستے میں ملا آب دیدہ
شاد کام اب ہوا دل کبیدہ
گھر پہنچتے ہی والد یہ بولے
تم بھی فیضان کتنے ہو بھولے
فیل ہو ہی گئے ہو تو کیا ہے
گرنا اٹھنا سدا سے رہا ہے
اک برس پھر سے محنت کرو تم
فیل ہونے سے یوں مت ڈرو تم
دوڑتا ہے جو گرتا وہی ہے
گر کے جو اٹھ گیا آدمی ہے

Mr Mohd Wakeel Astt HD TR KMC School BL No 4 H/O 5 Kankinara North 24 Parganas-743126 West Bengal

ادارہ

دنیا ایک عجائب خانہ

تتلی اُڑی، اُڑ جو چلی: آرٹسٹوں کے دماغ کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔ایک سے ایک نئی بات سوچ لیتے ہیں۔ترکی کے حسن کیل کو ہی لے لیجیے۔یہ صاحب ٹوتھ پک (دانت کریدنے کی تیلی) سورج مکھی کے بیج، سکّوں ، پرندوں کے پروں، پھلوں کی گٹھلیوں، چاول کے دانوں جیسی ننھی منی چیزوں پر اپنی آرٹ کے نمونے بناتے ہیں۔سوئی کی نوک جیسے اوزاروں سے یہ تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھرتے ہیں اور لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں۔کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔آپ بھی کوشش کر کے دیکھیے۔

ردّی کاغذ اور آرٹ: برطانیہ کے شہر برمنگھم میں آرٹ کے طالب علموں نے کاغذ اور کارڈ بورڈ سے ماڈل بنا کر سب کو حیران کر دیا ہے۔ان کے فن پاروں کی پچھلے دنوں ایک نمائش ہوئی جس میں وہ دل کش ماڈل رکھے گئے جو پہلی عالمی جنگ کے دنوں کے فوجی جوانوں ، ہتھیاروں ، کانٹے دار تاروں، اور فوجی چھاؤنی کے منظر پیش کرتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ بچّوں نے یہ ماڈل بے کار اور استعمال شدہ کاغذوں اور کارڈ بورڈز کی مدد سے بنائے ہیں۔ کیا آپ کے ذہن میں بھی کوئی ایسا کام ہے جو بے کار پڑی چیزوں کو استعمال میں لا کر کیا جا سکتا ہو؟ سوچیے، سوچیے!

فولادی مجسمے : اب امریکی شہر ہیوسٹن کے آرٹسٹ گیری ہوورے کی یہ ذہنی اُپج ملاحظہ فرمائیے۔اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھیے گا۔ یہ سیاہ لکیروں سے بنائے گئے خاکے نہیں بلکہ بڑے بڑے فولادی مجسمے ہیں اور انھیں فولاد یعنی اسٹیل کو پگھلا کر نہیں بلکہ اسٹیل کے کانٹوں چھریوں اور چمچوں کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ کہیے۔کیا اس سے پہلے کبھی ایسی آرٹ دیکھی ہے آپ نے؟

دل کا تھری ڈی ماڈل: ٹیکنالوجی انسانوں کے خوب کام آ رہی ہے۔امریکی ریاست کینٹکی میں ڈاکٹروں نے تھری ڈی پرنٹر کی مدد

سے 14 مہینوں کے ایک ایسے بچّے کی جان بچالی جس کے دل میں چار پیدائشی نقص تھے۔ انھوں نے بچّے کا سی ٹی اسکین کروا کے تھری ڈی پرنٹر کی مدد لیتے ہوئے بچّے کے دل کا ایسا ہو بہو دل بنالیا جسے ہاتھ میں لے کر وہ آپریشن کا نقشہ تیار کر سکیں۔ چاروں آپریشن کامیاب رہے اور بچّے کی جان بچ گئی۔

پہاڑیوں میں چھوٹا سا ہوٹل: کبھی آپ کا سوئٹزر لینڈ جانا ہو تو یہ ہوٹل ضرور دیکھیے گا۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر سوئٹزر لینڈ کی ایپی ٹالپ پہاڑیوں پر ٹیلوں کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اور یہ کوئی نیا ہوٹل نہیں۔ سو سال پرانا ہے اور 2012 میں یونیسکو سے سال کے بہترین گیسٹ ہاؤس کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔

خوش خبری کتّوں کے لیے: کتّوں کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ بے چارے 'بچّوں کی دنیا' نہیں پڑھ سکتے۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ہو سکے تو کسی طرح انھیں یہ بتا دیجیے کہ اب وہ فراری جیسی مہنگی اور آرام دہ گاڑی میں اپنے مالکوں کے ساتھ سفر کر سکیں گے۔ اسپیڈ اور ڈیزائن کے لیے دنیا بھر میں مشہور فراری گاڑی بنانے والوں نے اپنے نئے ماڈل، فراری ایف ایف کار کی ڈگی میں کتّوں کے لیے خاص آرام دہ جگہ بنائی ہے۔ کار کی قیمت صرف تین کروڑ روپے ہے اور یہ ساڑھے تین سیکنڈ میں زیرو سے 60 میل فی گھنٹہ کی رفتار پکڑ کر 208 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتی ہے۔ آیا مزا؟ ہمیں پورا یقین ہے، کتّے آپ سے یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوں گے۔ ذرا سنا کر تو دیکھیے۔

اونچی لہروں کے درمیان: فوٹوگرافر وہ انسانی مخلوق ہے جو تصویر کھینچنے کے جنون میں کہیں بھی کود پڑتا ہے۔ امریکی فوٹوگرافر کلارک لٹل کو سمندر کی اونچی اونچی لہروں کی تصویریں کھینچنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ وہ پچیس فٹ اونچی لہروں میں بھی اپنا کیمرہ لے کر کود پڑتا ہے۔ اوپر اور نیچے جو تصویریں آپ دیکھ رہے ہیں ان میں لہروں کے حسن کو اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کیمرے میں قید کیا گیا ہے!

آلو چپس کے ماڈل: آپ چاہیں تو لندن کا یہ مشہور 'بگ بین' چند منٹوں میں چبا کر کھا سکتے ہیں۔ جب کہ اسے بنانے میں کئی گھنٹے لگے ہیں۔ برطانیہ کی پوٹیٹو کاؤنسل نے حال ہی میں لندن میں 'چپ ویک' منایا جس کے تحت لندن کے کئی من چلے ڈیزائنر آرٹسٹوں نے آلو کے چپس تل تل کر لندن کی مختلف مشہور عمارتوں کے ایسے بے نظیر ڈیزائن بنائے کہ دیکھتے ہی منہ میں پانی آجائے۔ ان میں کچھ ماڈل فرنچ فرائز کی مدد سے بھی بنائے گئے جو چند گھنٹوں میں بن گئے مگر کچھ ماڈلز کے لیے ڈھیروں فرنچ فرائز کے ساتھ آدھا دن بنانے میں لگ گیا۔ ہائے، کاش ایسے میں ہم اور آپ بھی وہاں ہوتے!

سستا اور مضبوط گھر: پرانے اور ناکارہ کنٹینروں کا اب ایک اچھا استعمال سامنے آگیا ہے۔ امریکی شہر ہیوسٹن کی ایک کمپنی نے بیکا کنٹینروں کو آرام دہ گھروں میں تبدیل کردیا جن میں سلائڈنگ دروازے اور کھڑکیاں تو ہیں ہی زندگی دوسری ضرورتوں مثلاً ائر کنڈیشنر، ٹی وی وغیرہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی چھتوں پر مٹی ڈال کر پودے بھی لگائے گئے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ زلزلوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ ایسے کنٹینرز ہمیں ایک سستا اور مضبوط گھر فراہم کرسکتے ہیں جو ہر غریب اور عام آدمی کا خواب ہوتا ہے۔

موہاک کیٹ: لیجیے، بی مانو کو بھی فیشن کی ہوا لگ گئی۔ پہلی نظر میں ان کے کھڑے ہوئے بال دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ شائد انھیں بجلی کا کرنٹ لگا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ نیویارک کی یہ محترمہ یورپ میں بے حد مشہور موہاک ہیئر اسٹائل کی دیوانی ہیں اور اس انداز میں اپنی تصویر کھنچوا رہی ہیں جیسے فیشن کی سمجھ ان سے زیادہ کسی کو نہیں ہے۔

مشینی پرندہ: جرمنی کی ایک کمپنی نے کبوتروں کی طرح آزادی سے اڑنے والا ایک روبوٹ تیار کیا ہے جسے جاسوسی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نام اسمارٹ برڈ ہے اور وزن صرف 400 گرام۔ یہ آڑی ترچھی اڑان بھر سکتا ہے اور زمین پر کسی چھوٹی سی جگہ پر اتر سکتا ہے۔ امریکہ نے جو چھوٹے ہوائی جہاز ڈرون کے نام سے تیار کیے ہیں اور جن سے طے شدہ نشانوں پر بم گرائے جاسکتے ہیں وہ بھی دراصل ایک طرح کے روبوٹ ہی ہیں لیکن ان کا سائز بڑا ہوتا ہے اور یہ نظر آئیں تو انھیں آسانی سے مار گرایا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن جرمنی روبوٹ بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے نہ تو آسانی سے دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اسے پکڑنا

آسان ہے۔ لیکن یہ خفیہ مقامات پر چھوٹی موٹی چیزیں پہنچانے اور کسی علاقہ کا جائزہ لینے کے لیے بخوبی کام میں لایا جاسکتا ہے۔

سوئیٹر بننے والی روبوٹ خاتون: ٹیکنالوجی کا ایک اور مفید استعمال دیکھیے۔ یوں تو اونی کپڑے بازار میں بھی خوب مل جاتے ہیں لیکن اپنی مرضی کے ڈیزائن والا سوئیٹر، مفلر وغیرہ چاہیے تو یا تو اسے آپ خود بن لیجیے یا پھر برطانیہ میں تیار کی گئی اس 'خاتون روبوٹ' کی مدد لیجیے جو اپنے اندر فٹ کئے گئے سسٹم اور سینسرز کے ذریعے چار پانچ گھنٹوں میں سوئیٹر یا اسکارف تیار کردیتا ہے۔ معاف کیجیے کردیتی ہے۔ اس روبوٹ کو ایک خاتون کی شکل دی گئی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں لوہے کا ایک فریم رہتا ہے جس سے روبوٹک ہاتھ خود ہی اونی دھاگا پروتے ہیں اور پھر اس عمل کو دوہراتے ہوئے آپ کی فیڈ کیے ہوئے ڈیزائن کے مطابق گرم گرم کپڑا بن دیتے ہیں۔

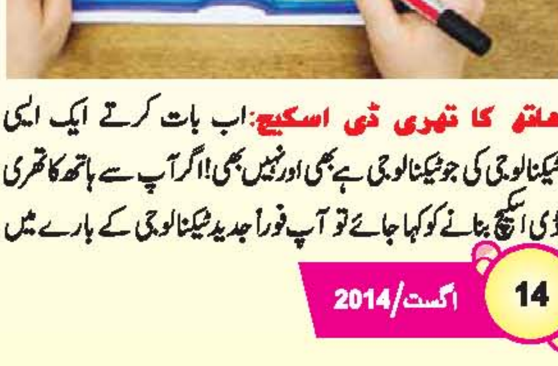

ہاتھ کا تھری ڈی اسکیچ: اب بات کرتے ایک ایسی ٹیکنالوجی کی جو ٹیکنالوجی ہے بھی اور نہیں بھی! اگر آپ سے ہاتھ کا تھری ڈی اسکیچ بنانے کو کہا جائے تو آپ فوراً جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں سوچنے لگیں گے۔ لیکن اگر عقل سے کام لیں گے تو ذرا سی دیر میں صرف اپنے ہاتھ سے آپ ہاتھ کا تھری ڈی اسکیچ بنا سکتے ہیں۔ کیسے؟ دیکھیے نیچے کی تصویروں میں اور پھر خود بھی ہاتھ آزمایئے! ◘

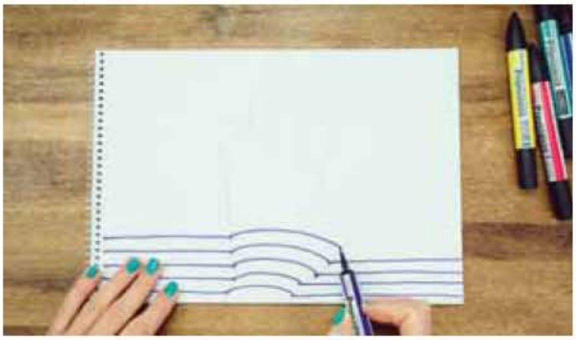

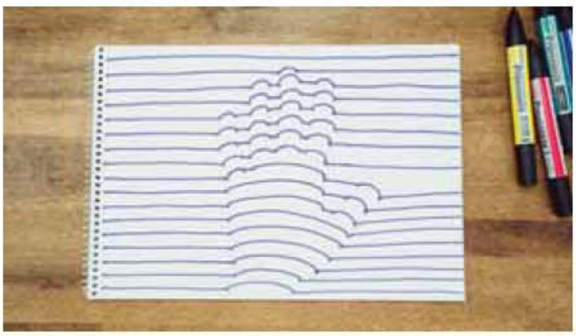

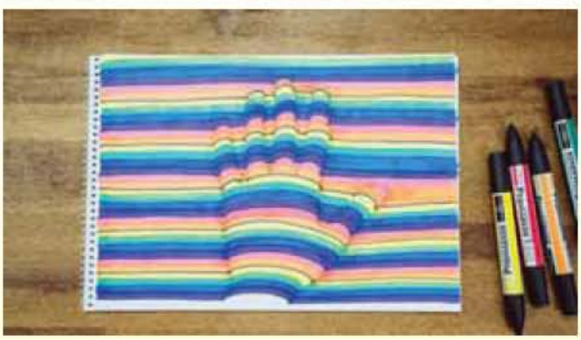

کیفی سنبھلی

بندر کا ولیمہ

بندر کا ہے ولیمہ
خوش خوش ہے باغ سارا

خوش ہیں بہت بندریاں
کرتی ہیں چیں چیں چاں چاں

مہمان بیٹھے آکر
پیڑوں کی ڈالیوں پر

حیران ہے زمانہ
سب کا جدا ہے کھانا

انگور سیب کیلے
لڈو، جلیبی، پیڑے

امرود مولی گاجر
کیا آم کیا چقندر

سامان یہ لایا بندر
سب چھین کر جھپٹ کر

خلق خدا ستائی
اپنی خوشی منائی

دنیا کا دل دکھاکر
کمزوروں کو ستاکر

اپنی خوشی نہ کرنا
بچو خدا سے ڈرنا

Mr Kaifee Sambhali Numberdar House Nooriyan Sarai Sambhal - 244302 UP

کہانی

مناظر عاشق ہرگانوی

آچھیں!!!

میری لال پنسل گم ہوگئی تھی۔ میں نے پنسل اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن نہیں ملی۔
پھر خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ اصغر کی حرکت ہوسکتی ہے۔
اس کا کمرہ الگ تھلگ ہے میں کبھی کبھار ہی اس کے کمرے میں جاتا ہوں۔ لیکن اس وقت لال پنسل کی ضرورت آپڑی تھی۔ اس لیے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ سامنے ہی بستر پر لال پنسل رکھی ہوئی تھی۔ پنسل اٹھاتے وقت بستر پر کھلی ہوئی ایک کاپی میں اس کی تحریر دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے کاپی اٹھالی۔ لکھا تھا:
''آج کل ابا جان سے میری ناراضی چل رہی ہے۔ کل ہی کی بات ہے مجھے ایک چھینک آگئی تھی۔ ابا جان نے امی سے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ وہ مجھے زبردستی بستر پر لٹا کر اور لحاف اوڑھا کر باجی سے کہنے لگیں ''ان دنوں موسم بڑا خراب ہے۔ پل میں گرمی، پل میں سردی۔ اصغر اس موسم کا شکار ہوگیا ہے۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ چھینک سے ٹائیفائڈ ہوجانے کا ڈر ہے۔''

باجی نے سر ہلا کر کہا ''جی امی! ابھی پرسوں پڑوس کی صفیہ کو چھینک آئی تھی۔ آج تک بخار میں پھنک رہی ہے۔''
باجی نے رضائی میں ہاتھ ڈال کر میری کلائی اپنی گرفت میں لیتے ہوئے نبض دیکھی، پھر بولیں ''دیکھئے امی زور کا بخار چڑھنے والا ہے کچھ اور اوڑھا دیں۔''
امی تشویش میں مبتلا ہوگئیں، اپنے کمرے سے فوراً کمبل لے آئیں۔

گرمی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ بستر سے کود کر بھاگنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ امی اور باجی زبردستی میرا بخار بڑھانے پر آمادہ نظر آ رہی تھیں۔ لحاف اور کمبل کے بوجھ سے کھسکنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

جب طبیعت جھنجھلا گئی تو آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھنے لگا۔

مجھے بدبداتے دیکھ کر باجی بولیں! لیجئے ہذیان بک رہا ہے، لگتا ہے بہت زور کا بخار چڑھا رہا ہے؟

''اللہ! ہمیں معاف کردیجئے، ہمارے اعمال ضرور خراب ہوں گے۔ اسی کی سزا مل رہی ہے...'' امی نے رونا شروع کردیا۔

ابا جان باہر تھے، انہوں نے امی کی بات سن لی تھی۔ اندر آ کر بولے ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ ہماری نیت صاف ہے اس لیے خراب بات زبان پر مت لاؤ۔ زندگی اور رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے معمولی بخار ہے، جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ بھروسہ رکھو۔''

''ڈاکٹر کو تو خبر کیجیے۔ انجکشن اور دوا کے بغیر یہ کیسے اچھا ہوگا۔'' امی نے کہا۔

''امی! پہلے تھرمامیٹر سے بخار دیکھ لیتے ہیں۔'' باجی کی آواز ابھری۔

''ہاں ہاں! ضرور دیکھو۔'' امی تھرمامیٹر لے آئیں۔ باجی نے لحاف تھوڑا سا کھسکا کر تھرمامیٹر منہ سے لگانا چاہا۔ میرا منہ کڑوا ہو رہا تھا۔ ابھی تک ان لوگوں سے ایک لفظ نہیں کہہ سکا تھا۔ ابا جان کے ڈر سے چپ تھا۔ لیکن انجکشن، دوا اور ڈاکٹر کے بارے میں سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ موقع اچھا دیکھ کر میں نے باجی کے ہاتھ پر زور سے کاٹ لیا۔

''اوئی اللہ'' باجی تھرمامیٹر چھوڑ کر دور ہٹ گئیں۔

''کیا ہوا؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔

''کاٹ لیا!''

''کاٹ لیا، اللہ خیر! ارے کہیں جن بھوت کا سایہ تو نہیں ہو گیا میرے بچے پر؟'' امی پھر رونے لگیں۔

''جن، بھوت؟'' باجی ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

''ارے ہاں! ابھی پچھلے ہفتہ رحیم بخش کے لڑکے پر جن آیا تھا۔ بڑی مشکل سے مسجد کے مولوی صاحب نے قابو میں کیا، کہتا تھا جان لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

مجھے لحاف کے اندر ہنسی آ گئی۔ میری آواز غالباً امی نے سن لی۔ بولیں:

''اے لو! اپنے آپ ہنس رہا ہے۔ اے میں کہتی ہوں، اجی سنیے، مولوی صاحب کو جلدی بلایئے۔'' امی کا رونا تیز ہو گیا۔

''ہاں ابا! فوراً! جایئے۔'' باجی کی آواز بھی گلوگیر تھی۔

امی اور باجی کو ابا جان کی طرف متوجہ دیکھ کر میں آہستہ آہستہ لحاف اور کمبل کھسکا کر پلنگ سے کودا اور باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ دروازہ

سے باہر نکلتے نکلتے مجھے زبردست چھینک آئی تھی ''آچ چھیں...''

''آ... آ... آچ... چھیں!'' یقین کیجیے یہ دوسری چھینک میری تھی جس کے آتے ہی اصغر کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ □

Dr Manazir Ashiq Harganwi Kohsar Bheekanpur - 3,
Bhagalpur- 812001

آصف جلیل احمد

ایک گونگا تین بہرے

ایک بہرا جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا اسے سخت بھوک لگ رہی تھی، مگر اس کی بیوی اب تک کھانا لے کر نہیں آئی تھی اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا آدمی بیٹھا گھاس کاٹ رہا تھا وہ شخص بھی بہرا تھا پہلے بہرے شخص نے کہا بھائی، میری بیوی میرے لیے کھانا نہیں لائی مجھے بھوک لگ رہی ہے، آپ میری بکریوں کی حفاظت کریں میں تب تک گھر سے کھانا کھا کر آتا ہوں۔

دوسرا بہرا سمجھا کہ یہ مجھے اپنی بکریوں کے لیے گھاس مانگ رہا ہے اس نے کہا، نہیں میں گھاس نہیں دوں گا۔

پہلا بولا۔ میں بہت جلد واپس آجاؤں گا، تم فکر نہ کرو۔

دوسرا بولا، یہ گھاس میں نے اپنی بکریوں کے لیے کاٹی ہے۔ میں یہ گھاس تمہیں نہیں دوں گا۔

پہلا سمجھا کہ دوسرا کہہ رہا ہے، تم جاسکتے ہو۔ وہ چلا گیا۔ جب وہ کھانا کھا کر واپس آیا تو اس نے اپنی بکریاں دیکھیں جو پوری تھیں اور وہ آدمی بدستور گھاس کاٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر یہ چاہتا تو میری ساری بکریاں لے جاتا مگر شریف آدمی لگتا ہے کیوں نہ میں اسے ایک لنگڑی بکری تحفے میں دے دوں۔ وہ اپنی لنگڑی بکری لے کر اس آدمی کے پاس گیا اور کہا، تم نے میری بکریوں کی حفاظت کی ہے اس لیے میں یہ بکری تمہیں تحفے میں دیتا ہوں لیکن یہ بکری لنگڑی ہے۔

دوسرے بہرے نے کہا۔ میں نے اس بکری کی ٹانگ نہیں توڑی۔ پہلا بہرا سمجھا کہ یہ لینے سے انکار کر رہا ہے۔

پہلا بولا۔ میں یہ بکری تمہیں خوشی سے دے رہا ہوں لے لو۔

دوسرا بہرا بولا۔ میں نے تمہاری بکری کی ٹانگ نہیں توڑی۔ اسی دوران سامنے سے ایک شخص آتا دکھائی دیا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ شخص بھی بہرا تھا دونوں بہروں نے اسے روکا، تیسرا بہرا شخص گھوڑے سے اتر آیا۔

پہلے بہرے نے کہا۔ میں اسے یہ بکری دے رہا ہوں مگر یہ نہیں لے رہا ہے۔

دوسرا بہرا بولا۔ اس بکری کی ٹانگ میں نے نہیں توڑی۔

تیسرا شخص بولا۔ ہاں تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ گھوڑا میں نے چوری کیا ہے میں یہ تمہیں واپس دیتا ہوں مجھے معاف کردو۔ انہوں نے سامنے سے ایک لمبی سفید داڑھی والے بوڑھے کو آتے دیکھا تو تینوں اس کے پاس گئے۔ اتفاق سے بوڑھا گونگا تھا۔

پہلا بہرا بولا۔ باباجی، میں کھانا کھانے گیا اس نے میری بکریوں کی حفاظت کی، اس لیے میں اسے اپنی ایک بکری دے رہا ہوں مگر یہ نہیں لے رہا ہے۔

دوسرا بہرا بولا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں نے بکری کی ٹانگ نہیں توڑی مگر یہ مانتا ہی نہیں۔

تیسرا بہرا بولا۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے چوری کی ہے اور یہ گھوڑا تمہارا ہے لیکن آپ لوگ مجھے معاف کردیں میں آئندہ چوری نہیں کروں گا۔ بوڑھا شخص تینوں کی عجیب وغریب باتیں سن کر تینوں بہروں کو غور سے دیکھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، بوڑھے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ وہ خاموشی سے تینوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ تینوں بہرے ڈر گئے۔ وہ سمجھے یہ بوڑھا کوئی جادوگر ہے، جو اُن پر جادو کرنا چاہتا ہے۔ وہ تینوں اپنی اپنی چیزیں لے کر بھاگ گئے۔ □

Mr Asif Jaleel Ahmed
Malegaon, Distt Nasik Maharashtra - 423203

ڈاکٹر مہیشور

غریب بچوں کی تعلیم کو کس طرح لوگوں نے منافع خوری کا دھندا بنا لیا ہے اس کے خلاف آنکھیں کھولنے اور دل ہلا دینے والی ایک درد مندانہ تحریر

آخر کار اس جھگی بستی میں بھی ایک پبلک اسکول کھل ہی گیا۔

جھگی جھونپڑی کے باشندے اپنے بچوں کے مستقبل سے بے فکر تھے کہ محنت مزدوری کریں گے اور کھائیں گے لیکن پبلک اسکول کے کھلتے ہی وہ فکر مند ہوئے کہ اپنے بچوں کا داخلہ کیسے کرائیں؟ جب بغل میں انگریزی اسکول کھل جائے تو اس کا فائدہ اٹھانا ہی چاہیے۔ بچہ اگر پڑھ گیا تو سیدھے افسر بنے گا۔ کیا پتہ سپاہی بن جائے۔ اگر بن گیا تو یہاں سے گاؤں تک سب دشمنوں سے بدلہ لیں گے۔

اسکول کا زور وشور سے اشتہار جاری تھا۔ صبح شام فلمی گانوں کی دھن پر پبلک اسکول کی تعریفیں کی جاتی تھیں۔

گاؤں سے نئی نئی آئی ایک عورت نے دوسری سے پوچھا "اے بہن ای پگلی (پبلک) اسکول کیا ہے؟"

دوسری نے جواب دیا "کا جانی، اے دیدی! سائت پگلین کے پڑھاوے بدلے سرکار کھولے ہوئی" (اے دیدی ہم کو نہیں معلوم! شاید پاگلوں کو پڑھانے کے لئے سرکار نے کھولا ہو)

ایک تیسری جو گفتگو سن رہی تھی بول اٹھی "ارے دھت! پگلی اسکول میں بچن کو انگریجی پڑھاول جاتے ہے، پڑھ لکھ کے جھنٹل مین بنت ہیں بچوے! بڑکی سرکاری نوکری پاوت ہیں۔"

"تب تو ہم ہوں بھیجیں اپنے لڑکا کے پگلی اسکول میں" پہلی عورت نے کہا۔

اسکول کا مالک ایک کباڑی تھا جس کی تیسری

پشت کباڑی کے دھندے میں تھی۔ انہوں نے خوب دولت کمائی اور روپے کے زور پر ہی کباڑی کا لڑکا ببلو کمار کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس لیے اب اسے عزت کے ساتھ دولت کمانے کی دھن سوار ہوئی۔ اسکول کالج میں اس پر خوب پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ دن میں کئی بار کباڑی جی! اے او کباڑی جی کے فقرے سنائی دیتے تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ کئی بار جھگڑے کی نوبت بھی آئی۔ لیکن شکر ہے کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

بی اے پاس کرنے کے بعد خاندانی کاروبار سے اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ دو دو گاڑیاں تھیں، گھر میں کولر اور اے سی لگے ہوئے تھے۔ پھر بھی ببلو کمار کو محسوس ہوتا کہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق اس کی عزت نہیں تھی۔ اپنے سماجی رتبے کو بڑھانے کے لیے اس نے ایک پبلک اسکول کھولنے کا عہد کیا اور اسی جھگی جھونپڑی کالونی کو اسکول کے لیے منتخب کیا۔

کالونی میں کوئی اسکول نہ تھا۔ وہاں سے تقریباً آدھا کلومیٹر دور ایک پرائمری اسکول تھا جہاں سب کچھ ہوتا تھا سوائے پڑھائی کے۔ اس اسکول میں ایک پختہ کمرہ تھا جہاں ہیڈ ماسٹر اور ٹیچر بیٹھتے تھے۔ کلاسیں پانچ تھیں اور ٹیچر صرف تین۔ ایک ٹیچر ہمیشہ اپنے ذاتی کام سے چھٹی پر رہتے۔ انجام کار ایک ٹیچر کو کبھی دو اور کبھی تین تین کلاسوں کا بوجھ سنبھالنا پڑتا۔ درحقیقت سرکاری ٹیچر ایک کلاس کا بوجھ بھی سنبھالنے سے کتراتے تھے اس لیے بچوں کو کچھ لکھنے یا گنتی، پہاڑا پڑھانے کا کام دے کر ٹیچر آرام سے اسکول کے اکلوتے پختہ کمرہ میں جا بیٹھتے۔ آرام فرماتے یا گفتگو کرتے۔ کلاسوں میں شور و غل ہوتا تو وہ سمجھتے کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ کلاس میں جو لڑکا زیادہ عمر کا اور مضبوط ہوتا اسے مانیٹر بنا کر کلاس چلانے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی۔ اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بجتے بجتے اساتذہ تروتازہ ہو کر ٹیوشن پڑھانے نکل

جاتے اور بچے بھوک پیاس سے نڈھال، ماحول سے بے زار اپنے گھروں کو بھاگتے۔ گھروں سے کبھی جو خوشامد کے بعد اور اکثر وبیشتر تھپڑ کھا کر بچے اسکول جاتے وہ عام طور پر روزانہ مرجھائے ہوئے گھر واپس آتے۔ بچوں کو اسکول جانا، پڑھائی لکھائی کرنا ویسے بھی ایک سزا معلوم ہوتی تھی۔ ماں باپ بھی مفت پڑھائی کی وجہ سے ہی انھیں سرکاری اسکول بھیجتے تھے۔

پبلک اسکول کھلتے ہی علاقے کے لوگ چونک گئے۔ عالیشان عمارت، میز، کرسی، پنکھے، الماریاں۔ بورڈ، بچوں کو لانے اور لے جانے کے لیے رکشے، وردی وغیرہ وغیرہ کتنے ہی آرام تھے۔ سب سے بڑھ کر انگریزی تعلیم اور انگریزی پڑھانے والی میمیں۔ سجی، دھجی سلیقہ مند اور خوبصورت۔ جن بچوں کو روزانہ مار پیٹ کر اسکول بھیجنا پڑتا تھا وہ بھی پبلک اسکول میں داخلہ کے لیے اتاولے ہونے لگے۔ ان کے والدین بھی بھونچکے رہ گئے۔ کون نہیں چاہے گا کہ اس کا بچہ فراٹے دار انگریزی بولے اور پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے۔ سارے گارجین داخلہ کے لیے اسکول آنے لگے۔ لیکن داخلے کے نام پر جو رقم بتائی جاتی اسے سن کر انھیں ایسا لگتا جیسے پیچھے سے کسی نے ہنٹر چلا دیا ہو۔ وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ روزانہ کنواں کھودنے اور پانی پینے والے مزدور یک مشت ہزاروں روپے کہاں سے بھرتے؟

اس سے ببلو کمار کے حوصلے کچھ پست تو ہوئے لیکن وہ بھی پورا گھاگھ اور موقع شناس تھا۔ پرنسپل بی کمار نے مائک پر اعلان کرادیا کہ لوگوں کی دشواریوں کو دیکھتے ہوئے اس سال فیس آدھی کردی گئی ہے۔ کاپی، کتاب، پر دس فیصد کمیشن، ڈریس پر بھی رعایت، صرف ایک نکٹائی خریدنا لازمی ہے۔

اس اعلان کے بعد پبلک اسکول میں داخلہ شروع ہوگیا۔ والدین نے فیس جمع کرکے کاپیاں اور کتابیں خریدلیں۔ اسکول چل نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ ایک چوتھائی بچوں کے گلے میں نکٹائی نہیں تھی۔ پرنسپل بی کمار نے سوچا کہ چلو آج نہیں تو کل ڈریس انھیں خریدنا ہی پڑے گا۔ تب تک اسکول کی پہچان بطور نکٹائی کافی ہے۔ اگر نکٹائی نہیں ہوگی تو سرکاری اور پبلک اسکول کے بچوں میں فرق کیا رہ جائے گا؟

پرنسپل نے ایک دن پریئر کے وقت نکٹائی اور غیر نکٹائی والے بچوں سے کہا "جو بچہ کل سے نکٹائی پہن کر نہیں آئے گا اسے اسکول میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا۔"

دوسرے دن بھی زیادہ تر بچے بغیر نکٹائی کے اسکول پہنچے اور اسکول گیٹ پر ہی روک لئے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ اگلے دن یا تو نکٹائی پہن کر آئیں یا اپنے گارجین کو ساتھ لے کر آئیں۔ بچے روتے بلکتے گھر لوٹ گئے۔ یہ وہی بچے تھے جنھیں اسکول بھیجنے کے لیے ماں باپ کو اکثر پیٹنا پڑتا تھا اور جو منہ بسورتے ہوئے اسکول جایا کرتے تھے۔

گاؤں سے نئی نئی آئی ایک عورت نے دوسری سے پوچھا "اے بہنی! ای نکٹائی کون پہیراوا (پہناوا) رہے ہو؟"

دوسری عورت نے جواب "اے دیدی! پگلی اسکول میں نکٹائی پہیراوا نہیں ہوئی تو اور کہاں ہوئی؟ دیکھی نا ہی ہو (دیکھ نہیں رہی ہو) ٹیپا میں (ٹی وی میں) لڑکینی (لڑکیاں) سب ایسا پہیراوا پہنتی ہیں کہ جہاں ڈھانپے چاہی وہاں اگھار (کھلا) رہت ہے اور جہاں اگھار

چاہی وہاں ڈھانپے رہتی ہیں۔ یہی سب نکٹائی پہیر ادا ہے اور کیا؟"

اس پر ایک جانکار عورت نے انہیں ٹوکا "دھت! بے وکوف (بیوقوف) ہی رہ گئی تم سب سہر (شہر) میں رہ کے بھی، ارے! گردن میں جو لال، نیلا، لتّا لٹکاوت ہے بابو صاحب لوگ اسی کا نام نکٹائی ہے۔"

آخر مجبور ہو کر بیس بیس روپے جمع کر کے گارجین نے نکٹائی خریدی اور بچوں کے گلے میں لٹکادی۔ بچوں کے گلے میں پڑی نکٹائی ان کے لئے ایک زحمت کے سوا کچھ نہ تھی۔ اکثر وہ نکٹائی کا ایک سرا چبانے لگتے۔ اس پر ڈانٹ پڑتی تو غصے سے بار بار انہیں کھینچتے۔ جھگڑا ہونے پر ٹائیاں کھینچ کر ایک دوسرے کو گرانے کو کوشش کرتے۔ نکٹائی کے وہ اور بھی جائز استعمال کر لیتے تھے۔ مثلاً ناک اور سلیٹ صاف کرنا، ٹفن کھانے کے بعد ہاتھ اور منہ پونچھنا اور کبھی کبھی پالتو جانوروں کے گلے میں پتے باندھنا وغیرہ وغیرہ۔ کچھ ہی دنوں میں نکٹائیوں میں لگی پلاسٹکیں ڈھلی پڑ گئیں اور نکٹائیاں بچوں کے گلے میں مالاؤں کی طرح جھولنے لگیں۔

اسکول کا سہ ماہی ٹسٹ ہوا۔ جو بچے کلاس میں فرسٹ آئے تھے انہیں انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

پرنسپل بی کمار انعام تقسیم کرنے والے تھے اور ایک میز کے پیچھے

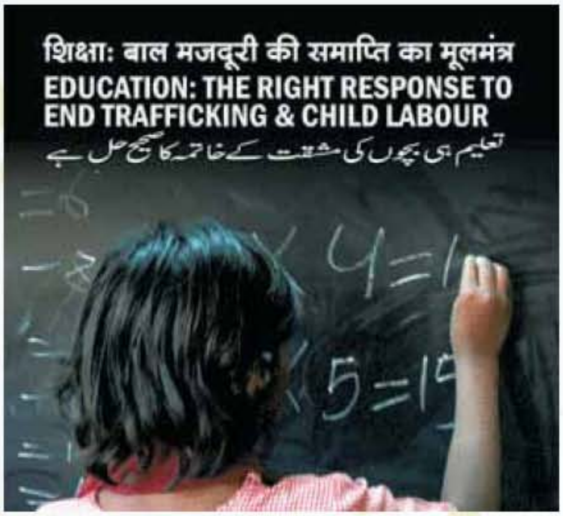

براجمان تھے۔ میز پر انعام کے چھوٹے بڑے پیکیٹ رکھے ہوئے تھے۔ پرنسپل کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

ایک لیڈی ٹیچر نے میز کے پاس کھڑے ہو کر کہا "نرسری میں فرسٹ ہیں ڈوری لال! ڈوری لال کھڑے ہو جایئے آکر سر سے پرائز لیجیے۔ بچوں تالی بجاؤ! ڈوری لال کے لیے۔"

پرنسپل بی کمار نے اشتیاق بھری نظروں سے بچوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکرائے۔

ڈوری لال شرماتے ہوئے کھڑا ہوا۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ چپلیں بھی نہیں تھیں۔ وہ کالے رنگ کا کچھا پہنے تھا۔ جو بنیان بدن پر تھا اس میں ستّر چھید تھے اور صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا کہ کبھی اس کا رنگ سفید رہا ہوگا۔

اس کی نکٹائی کا نچلا سرا گھٹنوں کو چھو رہا تھا اور ناک کی گندگی ہونٹوں تک لٹک آئی تھی۔ □

ماخذ: روزنامہ ہندوستان، پٹنہ

مضمون کہانی

شمس الاسلام فاروقی

ایمن نے بیٹل پالی

ایک دن ایمن اپنے گھر کے آنگن میں کھیل رہی تھی۔ اسی وقت ایک چھوٹا سا بٹن جیسا کیڑا اڑتا ہوا آیا اور ایک گملے میں لگے ہوئے پودے پر بیٹھ گیا۔ ایمن نے اسے دیکھا، وہ بہت پیارا سا کیڑا تھا جس کا رنگ نارنجی تھا اور اس پر گول گول کالے دھبے پڑے ہوئے تھے۔

ایمن نے خوبصورت کیڑے کو پکڑنا چاہا تو اس نے بھاگنے کے بجائے ڈر کر اپنے ہاتھ پیر اور چھوٹا سا سر کسی کچھوے کی طرح اپنے بٹن جیسے جسم کے نیچے سکیڑ لیا۔ ایمن کو وہ کیڑا اتنا اچھا لگا کہ وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی اور سوچنے لگی کہ کیوں نہ اس پیارے سے کیڑے کو پال لیا جائے۔ مگر اچھا ہوگا اگر پہلے اپنے دوستوں سے مشورہ کرلوں۔

یہ سوچ کر ایمن نے کیڑے کو اپنی پنسلوں کے ڈبے میں بند کردیا اور دوستوں کو بلانے چل دی۔ اس کے سب دوست اس کے گھر کے آس پاس ہی رہتے تھے اس لیے وہ جلد ہی سب کو بلا لائی۔ دوستوں میں ریان، عریشہ اور مناف تو لگ بھگ اسی کی عمر کے تھے مگر راحیل جو کہ ریان کا بڑا بھائی تھا عمر میں بڑا تھا۔ وہ اسکول جاتا تھا اور اب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب کہ ان سب نے تو ابھی نرسری جانا شروع ہی کیا تھا۔

جب سب دوست جمع ہوگئے تو ایمن نے ڈبہ کھول کر وہ کیڑا سب کو دکھایا جسے دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے۔ راحیل نے اسے دیکھا تو دیکھتے ہی کہا ''ارے ایمن یہ تو بیٹل Beetle ہے بیٹل! اسے لیڈی برڈ بیٹل کہتے ہیں۔ میرے پاپا نے مجھے ایک کتاب میں اس کی تصویر دکھائی تھی۔''

''مگر بھئی ایمن آخر یہ بیٹل تمہیں مل کہاں گئی؟'' عریشہ نے پوچھا۔

''میں نے اسے اپنے گھر کے صحن میں لگے ہوئے ایک پودے سے پکڑا تھا مگر شاید یہ باہر کے پارک سے اڑ کر یہاں آئی ہوگی۔''

ایمن نے جواب دیا۔ بیٹل کو دیکھ کر سب دوست بہت خوش تھے اور اس خیال سے تو انھیں کچھ زیادہ خوشی ہو رہی تھی کہ اب اس بیٹل کو پال لیا جائے گا اور پھر وہ اکثر اس سے کھیل سکیں گے۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر

دیکھ رہا تھا مگر جیسے ہی کوئی اسے ہاتھ لگاتا وہ کچھوے کی طرح اپنے پاؤں سکیڑ کر بٹن جیسی بن جاتی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ ہاتھ، پیر اور اپنا سر باہر نکال لیتی اور ڈبے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگتی۔ اب سب دوستوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھے کہ آخر اسے کہاں رکھا جائے اور کیا کھلایا جائے۔

ایمن جلدی سے شیشے کا ایک مرتبان اٹھالائی اور بولی ''اسے اس مرتبان میں رکھنا ٹھیک رہے گا کیونکہ ہم اسے آسانی سے دیکھ بھی سکیں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر حفاظت کے لیے مرتبان کا منہ تو بند کرنا پڑے گا۔ پھر بھلا اس میں ہوا کیسے جائے گی اور بغیر ہوا کے بیٹل کیا زندہ رہ جائے گی؟ وہ تو مر بھی سکتی ہے۔'' مناف نے کہا۔

راحیل نے مشورہ دیا ''اگر ہم اس مرتبان کے منہ پر ایک باریک کپڑا باندھ دیں تو بیٹل کی حفاظت بھی ہو جائے گی اور اسے ہوا بھی ملتی رہے گی۔'' سب دوستوں نے راحیل کی بات مان لی۔ اب اس کے کھانے کا انتظام کرنا تھا۔ ایمن بھاگی بھاگی گئی اور ایک کٹوری پر تھوڑی کھچڑی لے آئی۔ اسے آہستہ سے مرتبان میں ایک طرف رکھ دیا اور سب دوست غور سے بیٹل کو دیکھنے لگے۔ بہت دیر گزرنے کے بعد بھی بیٹل نے کھچڑی کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہ دیکھ کر دوسرے دوستوں نے بھی باری باری بیٹل کو الگ الگ چیزیں کھلانے کی کوشش کی۔ عریشہ ایک چھوٹے سے برتن میں دودھ لے آئی، مناف نے اسے کریم والا بسکٹ کھانے کو دیا جبکہ ریان اور راحیل گھر کے باہر پارک میں لگے پودوں کے پتے اور پھول جمع کر کے لائے۔ ان کا خیال تھا کہ کیونکہ بیٹل پارک سے اڑ کر آئی ہے اس لیے ضرور وہیں کی کوئی چیز کھاتی ہوگی۔

سب دوست بہت دیر تک کوشش کرتے رہے مگر بیٹل نے کوئی بھی چیز نہیں کھائی۔ اب تو سب ساتھی بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ بیٹل اسی طرح بھوکی رہی تو مرجائے گی۔ یہ سوچ کر سب اداس ہوگئے اور خاموشی سے منہ لٹکا کر مرتبان کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ وہ لگاتار بیٹل کو دیکھے جارہے تھے۔ مگر بیٹل تھی کہ کبھی اک جگہ بیٹھ جاتی اور کبھی مرتبان میں چاروں طرف چکر لگانے لگتی مگر وہ کوئی بھی چیز کھانے کو تیار نہیں تھی۔

اسی وقت ایمن کے دادو گھر کے اندر آئے۔ انھوں نے دیکھا ایمن اور اس کے سب دوست منہ لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے پوچھا ''کیوں بھی تم لوگ ایسی روتی شکلیں بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ کیا کسی نے تمہاری پٹائی کردی ہے؟''

ایمن نے آہستہ سے کہا ''نہیں! ہمیں کسی نے نہیں مارا، اصل بات یہ ہے کہ آج صبح میں نے اپنے گھر کے آنگن میں ایک خوبصورت سی بیٹل پکڑی تھی۔ ہم سب چاہتے تھے کہ اسے پال لیں اور اسی لیے ہم نے اسے شیشے کے اس مرتبان میں رکھ دیا تھا۔ مگر صبح سے یہ بیٹل بھوکی ہے۔ ہم ابھی تک اسے کتنی ہی چیزیں کھلانے کی کوشش کرچکے ہیں، مگر یہ کچھ بھی کھانے کو تیار نہیں ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہ یوں ہی بھوکی رہی تو زندہ نہ رہ سکے گی اور مرجائے گی۔ اسی لیے ہم سب لوگ اداس ہیں۔''

''اوہو! تو یہ وجہ ہے ہمارے ننھے دوستوں کی اداسی کی۔'' دادو نے کہا ''مگر بھئی ذرا ہمیں یہ تو معلوم ہو کہ ہمارے دوستوں نے اسے کیا کیا کھلانے کی کوشش کی تھی۔''

ریان اور ایمن نے بتانا شروع کیا: ''دیکھیے دادو پہلے تو ہم نے اسے کھچڑی کھانے کو دی، پھر دودھ اور بسکٹ کھلانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد ہمارے پارک میں جتنے پیڑ پودے موجود ہیں ان سبھی کے پتے اور پھول اس کے آگے رکھے۔ پانی بھی دیا تھا کہ کہیں یہ بے چاری پیاسی نہ ہو مگر دادو اس نے تو کسی بھی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اب آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں؟''

یہ سن کر ایمن کے دادو نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولے ''کہو تو دوستو ہم تمہاری اس بیٹل کی بھوک ہڑتال ختم کرادیں۔''

''دادو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ذرا جلدی کیجیے کہیں یہ بے چاری سچ مچ مر ہی نہ جائے۔'' ایمن نے کہا۔

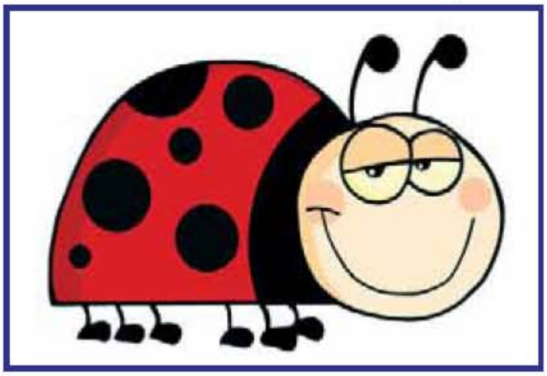

ایمن کے دادا نے عریشہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''عریشہ بیٹے اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے تو تمہارے پاپا نے گھر میں مولیاں بو رکھی ہیں۔'' عریشہ نے فوراً جواب دیا ''جی ہاں دادو مولیاں تو بہت لگی ہیں ہمارے گھر میں۔''

''تو پھر ذرا جلدی سے جاؤ اور مولی کے کچھ پتے توڑ لاؤ۔'' ایمن کے دادا نے کہا۔

عریشہ بھاگی بھاگی اپنے گھر گئی، اور کیاری سے مولی کے کچھ پتے توڑ لائی۔ ایمن کے دادا نے ایک ایک پتے کو غور سے دیکھا۔ انھوں نے دیکھا ایک پتے پر پیچھے کی طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بھنگے جیسے کیڑے چپٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہ پتہ لیا اور اسے آہستہ سے مرتبان میں ڈال دیا اور کھانے کی دوسری چیزیں جو بچوں نے اس میں رکھی تھیں باہر نکال دیں۔ سب دوست غور سے دیکھنے لگے۔

جلدی ہی وہ بیٹل پتے پر چڑھ گئی اور پھر ان بھنگوں کو پکڑ پکڑ کر کھانا شروع کر دیا۔ بچوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ وہ بیٹل کو کھاتا دیکھ کر خوش بھی تھے اور حیران بھی۔ وہ خوش تھے کہ اب اس بیٹل کو آسانی سے پالا جا سکتا ہے، اور حیران یہ سوچ کر تھے کہ یہ ننھی سی خوبصورت اور پیاری سی بیٹل گوشت خور ہے اور وہ بھی ایسی گوشت خور کہ کسی شکار خور جانور کی طرح بھنگوں پر جھپٹتی ہے اور انھیں چیر پھاڑ کر کھا جاتی ہے!! ◻

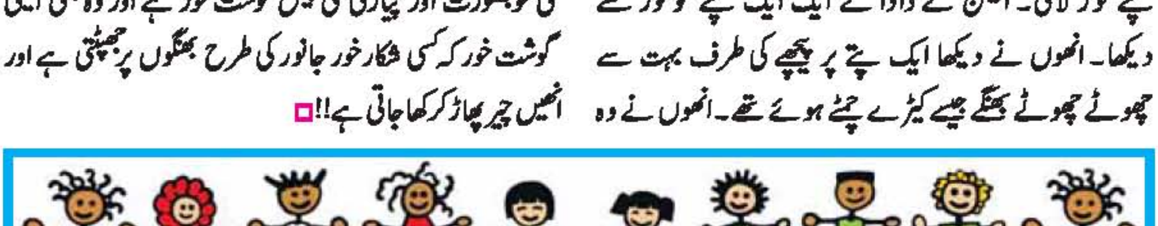

طہٰ نسیم

دیوار والی

پھٹی پھٹی منحوس آنکھیں اور کریہہ چہرہ دیکھ کر گھن سی آگئی۔ شام ہوتے ہی دیوار پر آجاتی ہے اور سبھی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔ آج تک میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔ جتنے بھی دوپائے یا چارپائے ہیں سبھی بولتے ہیں لیکن اسے دیکھیے۔ بخت کے منہ میں چہرے سے بڑی زبان ہے پھر خاموش رہتی ہے۔ جب بھی میری نظر پڑتی ہے تو ''ہش ہش بھاگ کم بخت'' کہہ کر بھگا دیتا ہوں۔ اس وقت رینگتی ہوئی یہ دیوار کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ ہر کوئی اس سے نفرت کرتا ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ یہ منحوس پھٹے دیدوں اسے دیکھے۔ بالشت بھر کی نہیں پھر بھی ہر کوئی اس سے خوفزدہ رہتا ہے۔ گھن کھاتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے میں کسی بھوتنی یا چڑیل کا ذکر کر رہا ہوں۔ جی نہیں! بھوتنیوں اور چڑیلوں کے قصے تو صرف سننے میں آتے ہیں لیکن اسے تو پوری گرمیوں اور برسات دیکھنا پڑتا ہے۔ نہ جانے سردیاں آنے پر یہ کہاں چلی جاتی ہے۔ جیسے ہی مارچ کا مہینہ شروع ہوتا ہے دوبارہ دیوار پر اس جگہ ڈیرہ جمالیتی ہے۔ لگتا ہے اسے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے جیسے ہی ٹیوب لائٹ روشن ہوتی ہے نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے اور دیوار پر ٹیوب لائٹ کے آس پاس ہی رہتی ہے۔ نہ کسی سے بولنا صرف دیدے پھاڑے بنا پلک جھپکائے تکتی رہتی ہے۔

کئی بار سوچا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے انٹرویو کیے ہیں کبھی اس کا انٹرویو بھی کرلوں لیکن یہ ہے کہ بولتی ہی نہیں۔ میری تو سمجھ میں

نہیں آتا کہ کوئی خاموش رہ کر بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خاموش رہنے والے بہت کائیاں ہوتے ہیں اور زیادہ بولنے والوں کے مقابلے خطرناک ہوتے ہیں۔ نانی امی تو رات کے وقت اس کا نام لینا مصیبت سر پر لینے کے برابر سمجھتی ہیں۔ اس لیے اسے دیوار والی کہتی ہیں۔ ہم سب بھی اسے رات کے وقت اسی نام سے پکارتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اگر رات کو اس کا نام لے لو تو خواب میں آ کر ڈراتی ہے۔ یہی سوچ کر ایک روز میں نے اسے ڈانٹ ہی دیا۔ ''اے منحوس چھپکلی! کئی سال سے دیکھ رہا ہوں تو دیدے پھاڑے ہمیں گھورتی رہتی ہے۔ اری منحوس تو کہیں اور کیوں نہیں چلی جاتی، کیوں یہاں مری ہوئی ہے۔'' چھپکلی کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا وہ بغیر آنکھیں جھپکائے مجھے گھورتی رہی۔

اگلے روز چھٹی تھی اس لیے میں رات دیر تک لکھتا رہا۔ مجھے اپنا ناول پورا کرنا تھا۔ نہ جانے کتنی رات بیت گئی وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچانک دیوار کی جانب سے ایک سایہ نیچے اترتا محسوس ہوا، میں ڈر گیا۔ اوپر دیکھا تو چھپکلی قہر آلود نگاہوں سے مجھ گھورتی ہوئی دھیرے دھیرے نیچے آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بالشت بھر کی نہیں ایک فٹ کی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ میں کاغذ لے کر اسے ڈرانے کی کوشش کی، لیکن وہ بے خوف نیچے اترتی رہی۔ میں نے ہش ہش کہہ کر ڈرانا چاہا لیکن وہ بالکل بھی نہیں ڈری۔ بلکہ وہ میری جانب ایسے بڑھ رہی تھی کہ لپک کر مجھے منہ میں دبا لے گی۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں بری طرح کانپنے لگا، مجھ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ کرسی سے اٹھ کر بھاگ جاؤں یا کسی کو آواز دے لوں۔

چھپکلی دیوار سے اتر کر میز پر آ گئی اور اس نے اپنی نظریں میری آنکھوں میں گاڑ دیں۔ میں نے اتنا خوف ناک منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چھپکلی نے منہ کھولا اور زنانہ آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی ''کیوں میاں! بہت برا بھلا کہتے ہو مجھے آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو اس قدر مجھ سے نفرت کرتے ہو؟''

چھپکلی کو بولتا دیکھ کر بری طرح ڈر گیا تھا۔ مجھ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بول بھی سکتی ہے اور وہ بھی انسان کی طرح۔

میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''دیکھو چھپکلی! تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا... دراصل...'' اس کے بعد مجھ سے بولا نہیں گیا۔

چھپکلی نے خفگی کے ساتھ کہا ''ہاں ہاں بولو اور بولو، دراصل کیا؟''

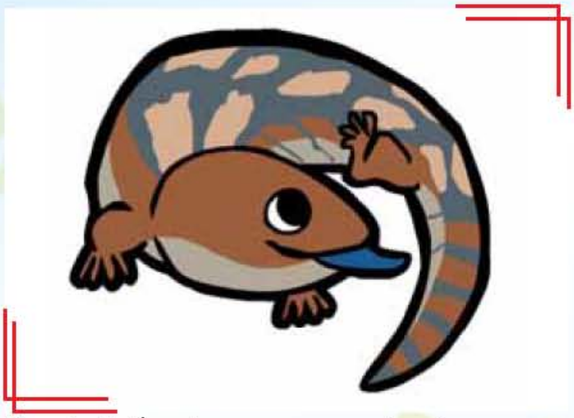

’’دراصل...تمہاری...اوہ! آپ کی صورت ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ سے سب ڈرتے ہیں۔ میں بھی ڈرتا ہوں، اور یہ آنکھیں پھاڑ کر جو آپ دیکھتی ہیں اس سے سبھی خوف کھاتے ہیں۔‘‘

’’تو میری بری شکل اور آنکھیں ہی مجھ سے نفرت کا سبب ہیں؟‘‘

’’جی! جی ہاں...بس...‘‘

چھپکلی نے قہقہہ لگایا ’’میاں یہ تو بتاؤ میں نے کبھی کسی کے کاٹا ہے، کسی کو پنجہ مارا ہے، کبھی تمہارے پھل یا سبزیاں لے کر بھاگی ہوں، کسی انسان پر میں نے کبھی حملہ کیا ہے۔ بتاؤ...بتاؤ...‘‘

’’جی نہیں! ایسا تو کبھی نہیں سنا۔‘‘

’’تو میرے بھائی کسی کی صورت بری ہونا کیا اس سے نفرت کی وجہ بن سکتا ہے۔ بڑی عجیب منطق ہے تم انسانوں کی۔ ایک بات بتاؤ اگر تمہاری ماں بدصورت ہوتی، یا تمہارا بچہ میری طرح پھٹی آنکھوں والا اور بدشکل ہو تو تم اسی طرح نفرت کروگے، جس طرح مجھ خاموش رہنے والی بے ضرر مخلوق سے کرتے ہو؟ مجھے یہ تو بتاؤ تم انسان بلی اور کتوں کے خوبصورت رنگوں اور چہروں کو دیکھ کر اپنے گھروں میں رکھتے ہو۔ یہ جانور ریبیز، دمہ اور نہ جانے کون کون سے امراض پھیلاتے ہیں، کاٹتے ہیں، پنجے مارتے ہیں، گندگی پھیلاتے ہیں پھر بھی تم ان کی خوشی خوشی خدمت کرتے ہو۔ میں تو ایسا کچھ بھی نہیں کرتی بلکہ تمہارے گھر میں آنے والے کیڑے مکوڑوں کو کھا کر ان سے تمہاری حفاظت کرتی ہوں۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتی ہوں اس کے باوجود تم مجھ سے اس قدر نفرت کرتے ہو۔ کبھی تم نے میرے صبر اور خاموشی کو

محسوس کیا ہے۔ کتوں کی طرح رات رات بھر نہیں بھونکتی، کسی کو ڈراتی نہیں، کسی سے کھانا نہیں چھینتی، پھر تم میرے خلاف کیوں ہو؟‘‘

چھپکلی کے ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے شرمندگی اور پچھتاوا تھا۔ مجھے ایک چھپکلی نے انسانیت کا سبق سکھایا تھا کہ محبت اور نفرت کا پیمانہ ظاہری خوبصورتی نہیں بلکہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچانا اور خاموش خدمت ہے۔ زیادہ چیخ پکار کرنے والے اور دوسروں کا حق چھیننے والے ان لوگوں کے مقابلے زیادہ خطرناک ہیں جو اپنی محنت سے معمولی کھانا کھاتے ہیں، شور شرابہ نہیں کرتے، کسی کا امن وسکون برباد نہیں کرتے۔ چپ چاپ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔

میں نے چھپکلی سے معافی مانگی۔ وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی اس کی سرخ آنکھیں دوبارہ پیلی ہوگئیں۔ اب اس کے چہرے پر وہ خوفناکی اور ڈراؤنا پن نہیں تھا جو دیوار سے اترتے وقت تھا۔ وہ دوبارہ اپنے اصل سائز میں آگئی تھی۔ وہ پلٹی اور دھیرے دھیرے دیوار پر چڑھنے لگی۔ میں چپ چاپ اسے دیوار پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ گر گئی۔ میں ڈر کر چونک پڑا اور میری آنکھ کھل گئی۔ رات کافی بیت چکی تھی اور میں اپنی میز پر سر جھکائے نیند کے آغوش سے باہر آگیا تھا۔ میں نے نظر اٹھائی چھپکلی ٹیوب لائٹ کے پاس ہی موجود تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی لیکن اب مجھے وہ بدصورت اور کراہت آمیز بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ □

Mr Taaha Naseem
2793 Pahadi Bhojla Turkman Gate Delhi-110006

شمیم احمد صدیقی

اونٹ پرندہ

بھلا یہ بھی کچھ نام ہوا۔ کہاں اونٹ اور کہاں پرندہ۔ مگر کیا کیجیے۔ میرا نام ہی ایسا ہے کہ اس میں اونٹ پہلے آتا ہے اور مرغا بعد میں۔ بات یہ ہے دوستو کہ میں اپنی اصلیت کے لحاظ سے تو ایک پرندہ ہی ہوں لیکن میری لمبی ٹانگوں، لمبی گردن اور دوسری چند خاصیتوں کی وجہ سے آپ کے بزرگوں نے میرا رشتہ اونٹ سے جوڑ دیا ہے۔ آپ ٹھیک سمجھے۔ لوگ مجھے شترمرغ کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ فارسی زبان میں اونٹ کو شُتر اور پرندہ کو مرغ کہتے ہیں۔ اُردو اور ہندی زبانیں تو ہیں ہی فارسی کی بہنیں، لہٰذا ہندی اور اُردو میں بھی لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

دنیا کے تمام پرندوں کے مقابلے میں میرا جسم سب سے بڑا ہے لیکن میں اور پرندوں کی طرح ہوا میں نہیں اُڑ سکتا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ لگ بھگ ڈیڑھ سو کلوگرام وزنی جسم کو ہوا میں اڑانے کے لیے تو مجھے پورا ایک ہوائی جہاز ہونا چاہیے جو میں بدقسمتی سے بالکل نہیں ہوں۔ لیکن اپنی اس کمی پر مجھے کوئی افسوس بھی نہیں کیوں کہ قدرت نے مجھے زمین پر دوڑنے کی ایسی صلاحیت دی ہے کہ کوئی دوسرا پرندہ اور بہت سے جانور یہاں تک کہ ایک تیز رفتار سائیکل سوار بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں 70 کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی دوڑ لیتا ہوں، چنانچہ مجھے زمین پر سب سے تیز دوڑنے والا دوپایا یعنی دو پیروں والا جانور بھی مانا جاتا ہے۔ میری پتلی، لمبی اور مضبوط ٹانگیں تیز دوڑنے میں میری مدد کرتی ہیں۔ ہاں جسم کا توازن دُرست رکھنے اور دوڑنے کے دوران اپنی سمت بدلنے کے لیے میں اپنے پروں کو بھی کام میں لاتا ہوں۔ بس یوں سمجھیے کہ میں ایک نہ اڑنے والا پرندہ ہوں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا میرا رشتہ اونٹ سے جوڑنے کی وجہ میری لمبی ٹانگیں اور اونچی گردن ہیں۔ میری ٹانگیں چھ سے آٹھ فٹ لمبی ہوتی ہیں۔ بالغ ہونے پر اونچی گردن کی وجہ سے ہماری اونچائی سات سے نو فٹ تک ہوجاتی ہے۔ اتنی کہ لمبا انسان پاس کھڑا ہو تو وہ بھی چھوٹا پڑ جائے۔ اونچی گردن کا ایک فائدہ یہ ہے کہ میں اونٹ ہی کی طرح پیڑ پودوں کی پتیاں کھا کر پیٹ بھر لیتا ہوں اور اونٹ ہی کی طرح کئی ہفتوں تک پانی پیے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔ مزید یہ کہ انسان کو اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر آدھے گھنٹے تک تو دوڑ لگا ہی لوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ جگہوں پر مجھے لوگ گھوڑے گدھے کی طرح سواری کے لیے بھی

▲ابا جان انڈے سیتے ہوئے

استعمال کرتے ہیں۔ اور سرکس میں تو جوکر حضرات باقاعدہ مجھے گھوڑے کی طرح دوڑاتے ہیں۔ کئی جگہ چھوٹی موٹی گاڑیوں میں مجھے گھوڑے کی طرح بھی جوتا جاتا ہے۔

خیر، اب آپ میری خوراک کے بارے میں سنیے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ تمام پرندوں کی مرغوب غذا کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں۔ تو جناب مجھے بھی کیڑے مکوڑے کھانا بہت پسند ہے۔ لیکن میں پوری طرح نان ویج نہیں ہوں۔ جیسا کہ ابھی بتایا، پیڑ پودوں کی پتّیاں اور چھوٹے موٹے پھل پھول بھی میں خوب کھاتا ہوں۔

ایک بات اور۔ قدرت نے مجھے صرف جسمانی لحاظ سے ہی بڑا نہیں بنایا بلکہ میری آنکھیں بھی بہت بڑی بنائی ہیں۔ اپنی لمبی گردن اور بڑی آنکھوں کی وجہ سے میں بہت دور تک دیکھ سکتا ہوں اور کسی آنے والے خطرے سے بچنے کے لئے بھاگ سکتا ہوں۔ ہاں اگر کوئی دشمن بالکل قریب آجائے اور حملہ کر دے تو میں اپنی ٹانگوں میں موجود نوکیلے اور مضبوط ناخنوں سے اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔ جنگلی کتے، بھیڑیا اور دوسرے پھاڑ کھانے والے جانور مجھ پر حملہ کرنے کی مشکل سے ہی جرأت کرتے ہیں۔ جنگلات میں اپنے دشمنوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے ہم لوگ اکیلے نہیں گھومتے پھرتے بلکہ جھنڈ بنا کر آتے جاتے ہیں۔

میرا اصلی وطن تو افریقہ اور عرب کے ریگستان ہیں لیکن اب آپ مجھے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی امریکہ، ایشیا کے بعض حصّوں کے علاوہ ہر اچھے چڑیا گھر میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔ میرے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ ریگستان میں طوفان آنے یا کسی اور خطرہ کو دیکھ کر میں اپنے سر کو ریت میں چھپا لیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جب سوتا یا آرام کرتا ہوں تو اپنی گردن کو زمین پر پھیلا دیتا ہوں یا اسے جھاڑیوں میں چھپا کر بیٹھ جاتا ہوں جس کے بعد دور سے دیکھنے پر میرا جسم کوڑے کے ڈھیر جیسا لگتا ہے اور کئی جانور جو میرے دشمن ہیں میری گردن نظر نہ آنے کی وجہ سے مجھے انور کی بجائے کچھ اور سمجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ناواقف لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں طوفان یا خطرہ آنے پر اپنے منہ اور گردن کو ریت میں دھنسا دیتا ہوں۔ انگریزی والوں کی جہالت دیکھیے کہ انھوں نے تو میرے نام

▲اب اگر یہ صاحب اپنی گردن گھاس میں چھپالیں تو؟

پر شتر مرغی رویّے اور شتر مرغیت کے محاورے بھی بنا رکھے ہیں۔ شکر ہے اردو میں ایسے فضول محاورے نہیں ہیں۔

دوسرے پرندوں کی مانند میری مادہ بھی انڈے دیتی ہے لیکن ایک مرتبہ میں ایک یا دو انڈے نہیں بلکہ لگ بھگ ایک درجن انڈے۔ جس طرح میں اپنی جسامت کے لحاظ سے تمام پرندوں میں بڑا ہوں اسی طرح ہمارا انڈا بھی دوسرے تمام پرندوں سے بڑا ہوتا ہے اور اس کا وزن ڈیڑھ کلو تک ہوسکتا ہے۔ لیکن ڈیڑھ سو کلو وزن کے جسم کے لحاظ سے یہ انڈا سوواں حصہ ہی ہوا جبکہ دوسرے پرندوں کے انڈے اور جسم کے وزن میں فرق اس سے کہیں کم ہوتا ہے۔ پھر بھی میرے ایک ہی انڈے سے تیار کیا گیا آملیٹ آٹھ لوگوں کے ناشتے کے لیے کافی ہوسکتا ہے البتہ ابال کر کھانے کے لیے آپ کو ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ جائے گا کیونکہ اندر تک کے حصہ میں گرمی پہنچانے کے لیے خاصا وقت چاہیے۔

مادہ شتر مرغ بے چاری ایک ہی وقت میں لگ بھگ ایک درجن انڈے دینے سے خاصی کمزور ہو جاتی ہے لہٰذا انڈوں کو سینے کی ذمہ داری نر شتر مرغ کو ہی نبھانی پڑتی ہے۔ مرغی کے انڈوں سے تو اکیس دن میں بچے تیار ہو کر باہر آجاتے ہیں لیکن ہمارے انڈوں سے بچے تیار ہونے میں دوگنا وقت یعنی بیالیس دن درکار ہوتے ہیں۔ میرے بچوں کی پرورش کے لیے بھی قدرت نے بڑا انوکھا طریقہ رکھا ہے۔ انڈے دینے کے بعد مادہ شتر مرغ ایک تہائی انڈوں کو زمین کے اندر دفن کر دیتی ہے۔ باقی ایک تہائی انڈوں کو زمین کے اوپر گھاس پھوس سے ڈھک کر دھوپ میں چھوڑ دیتی ہے۔ اب جو ایک تہائی انڈے اور بچتے ہیں انھیں 42 روز تک سینے کی ذمہ داری میاں شتر مرغ کی ہوتی۔ انڈوں سے بچے برآمد ہونے پر والد صاحب زمین کے اوپر دھوپ میں چھوڑے گئے انڈوں کو ایک ایک کر کے توڑتے ہیں اور بچوں کو پلاتے ہیں۔ چند روز بعد زمین میں دفن کیے گئے انڈوں کا نمبر آتا ہے۔ جب وہ توڑے جاتے ہیں تو ان سے نکلنے والے مادّے کو کھانے کے لیے بہت سے کیڑے مکوڑے جمع ہو جاتے ہیں جنھیں پکڑ کر ابا اور امّی بچوں کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ بچے بڑے شوق سے یہ کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں۔ چند روز

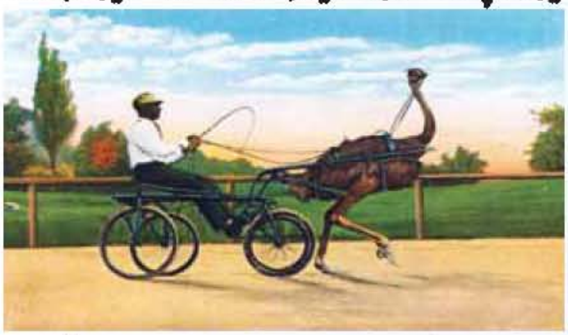

بعد بچے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ خود ہی پودوں میں چھپے کیڑے مکوڑے تلاش کر کے اپنا پیٹ بھر لیں۔

اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ انسان دوسرے پرندوں کے گوشت کی طرح میرا گوشت بھی کھاتا ہے اور جس طرح دیگر جانوروں کی کھال سے چمڑا تیار کر کے اپنے کام میں لاتا ہے تو میری کھال سے بھی چمڑا تیار کر کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے دو سو سال میں ہماری تعداد میں خاصی کمی آئی ہے۔ لیکن اب ہماری نسل کا دھیان رکھا جانے لگا ہے اور پولٹری فارم میں جس طرح مرغ کی نسل بڑھائی جاتی ہے اسی طرح ہماری بھی فارمنگ ہونے لگی ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ انڈے اور گوشت حاصل ہو سکے۔ ◻

Dr Shameem Ahmed Naseem Manzil Madahganj Police Post, Seetapur Road Lucknow - 226020

□ محسن باعشن حسرت

پیڑ لگائیں

ہم سب مل کر پیڑ لگائیں
ہر رستے پر پیڑ لگائیں
گڈو، ببلو، چنو، شبو
آؤ گھر گھر پیڑ لگائیں

پیڑ بڑے جب ہوجائیں گے
راہی آکر سوجائیں گے
ہم بھی آکر بیٹھیں گے تب
اور سپنوں میں کھو جائیں گے

پیڑ پہ جب پتے آتے ہیں
پتوں پر پھول آجاتے ہیں
پھل آتے ہیں ڈھیرے ڈھیرے
شوق سے ہم ان کو کھاتے ہیں

سایہ دینا کام ہے ان کا
اسی لیے تو نام ہے ان کا
سب آپس میں مل کر رہنا
ایک یہی پیغام ہے ان کا

گرمی جاڑا سب سہتے ہیں
کہاں کسی سے کچھ کہتے ہیں
بھیگ کے بارش کے پانی میں
بس خاموش کھڑے رہتے ہیں

پیڑ نہ کاٹیں آؤ بچو!
سب کو یہ سمجھاؤ بچو
پیڑ کرشمہ ہیں قدرت کا
مل کر انہیں بچاؤ بچو

Mr Mohsin Baeshan Hasrat Princep Street 1st Flr Kolkata -700072

ریچھ کے بچّے بھولا بھالو! کی حماقتیں!

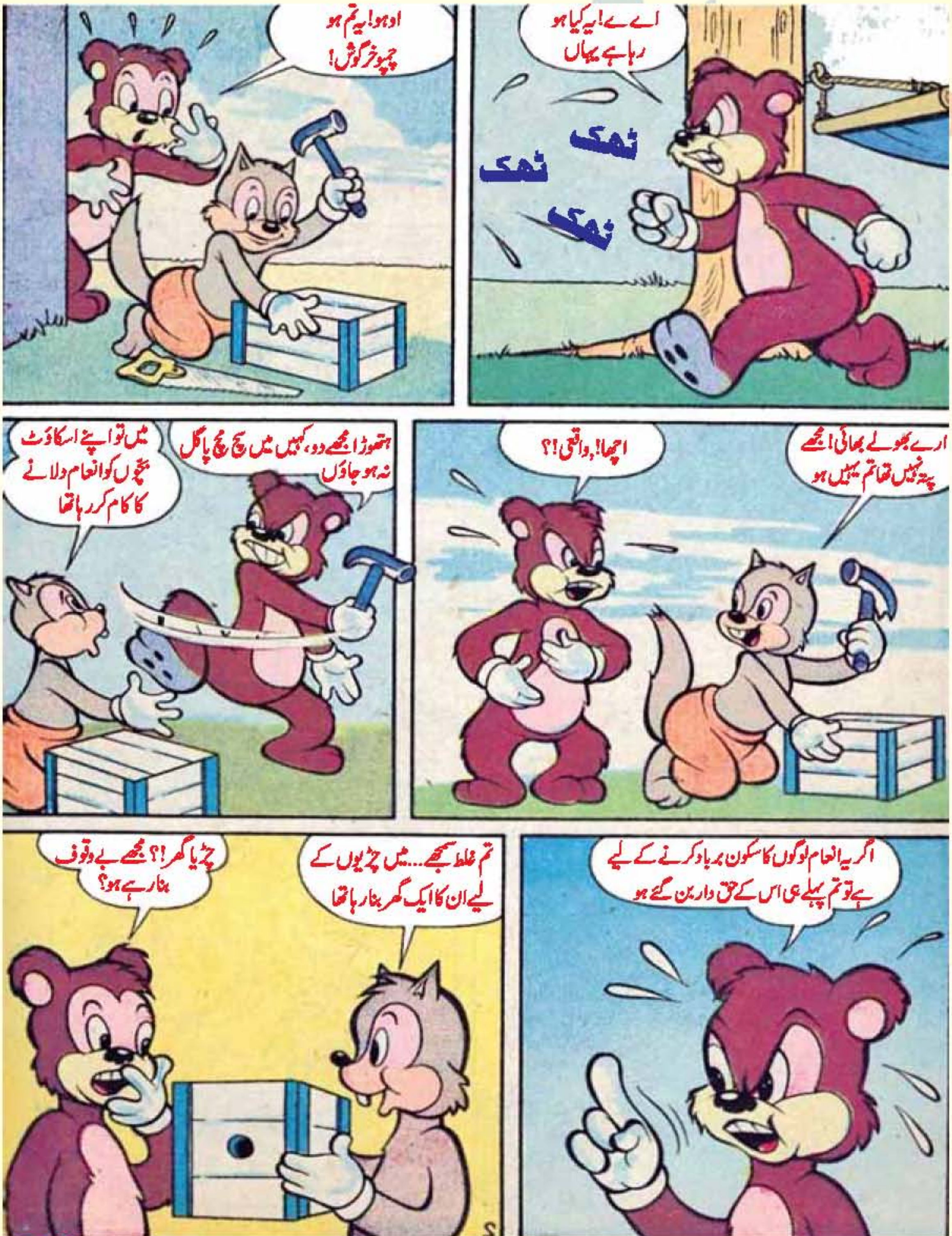
اے ے! یہ کیا ہو رہا ہے یہاں
ٹھک
ٹھک
ٹھک
اوہو! یہ تم ہو چمپو خرگوش!
ارے بھولے بھائی! مجھے پتہ نہیں تھا تم یہیں ہو
اچھا! واقعی!؟
ہتھوڑا مجھے دو، کہیں میں سچ مچ پاگل نہ ہو جاؤں
میں تو اپنے اسکاؤٹ بچوں کو انعام دلانے کا کام کر رہا تھا
اگر یہ انعام لوگوں کا سکون برباد کرنے کے لیے ہے تو تم پہلے ہی اس کے حق دار بن گئے ہو
تم غلط سمجھے... میں چڑیوں کے لیے ان کا ایک گھر بنا رہا تھا
چڑیا گھر!؟ مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟

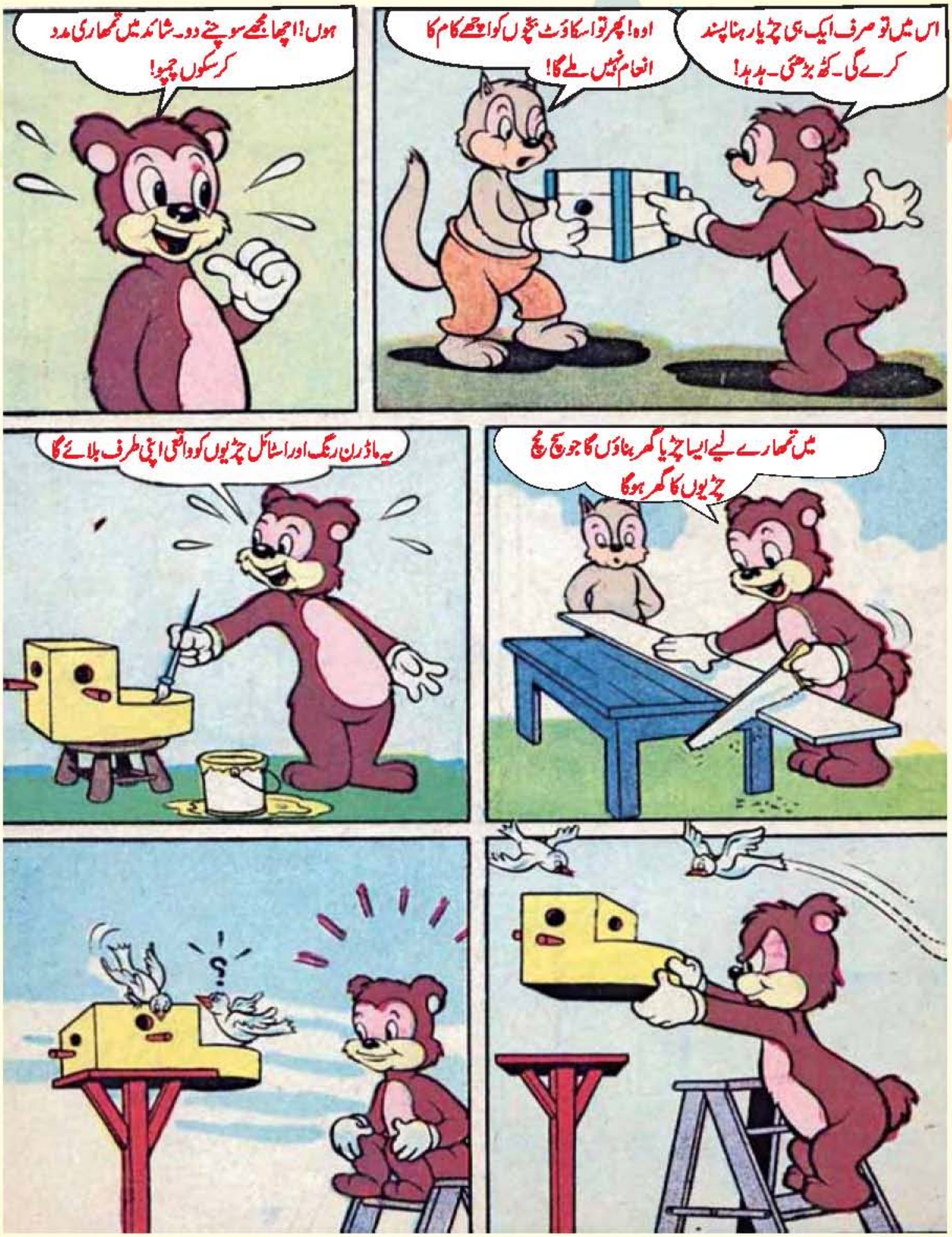
اس میں تو صرف ایک ہی چڑیا رہنا پسند کرے گی۔ کٹھ بڑھئی۔ ہد ہد!
اوہ! پھر تو اسکاؤٹ بچوں کو اچھے کام کا انعام نہیں ملے گا!
ہوں! اچھا مجھے سوچنے دو۔ شائد میں تمھاری مدد کرسکوں چمپو!
میں تمھارے لیے ایسا چڑیا گھر بناؤں گا جو سچ مچ چڑیوں کا گھر ہوگا
یہ ماڈرن رنگ اور اسٹائل چڑیوں کو واقعی اپنی طرف بلائے گا
?

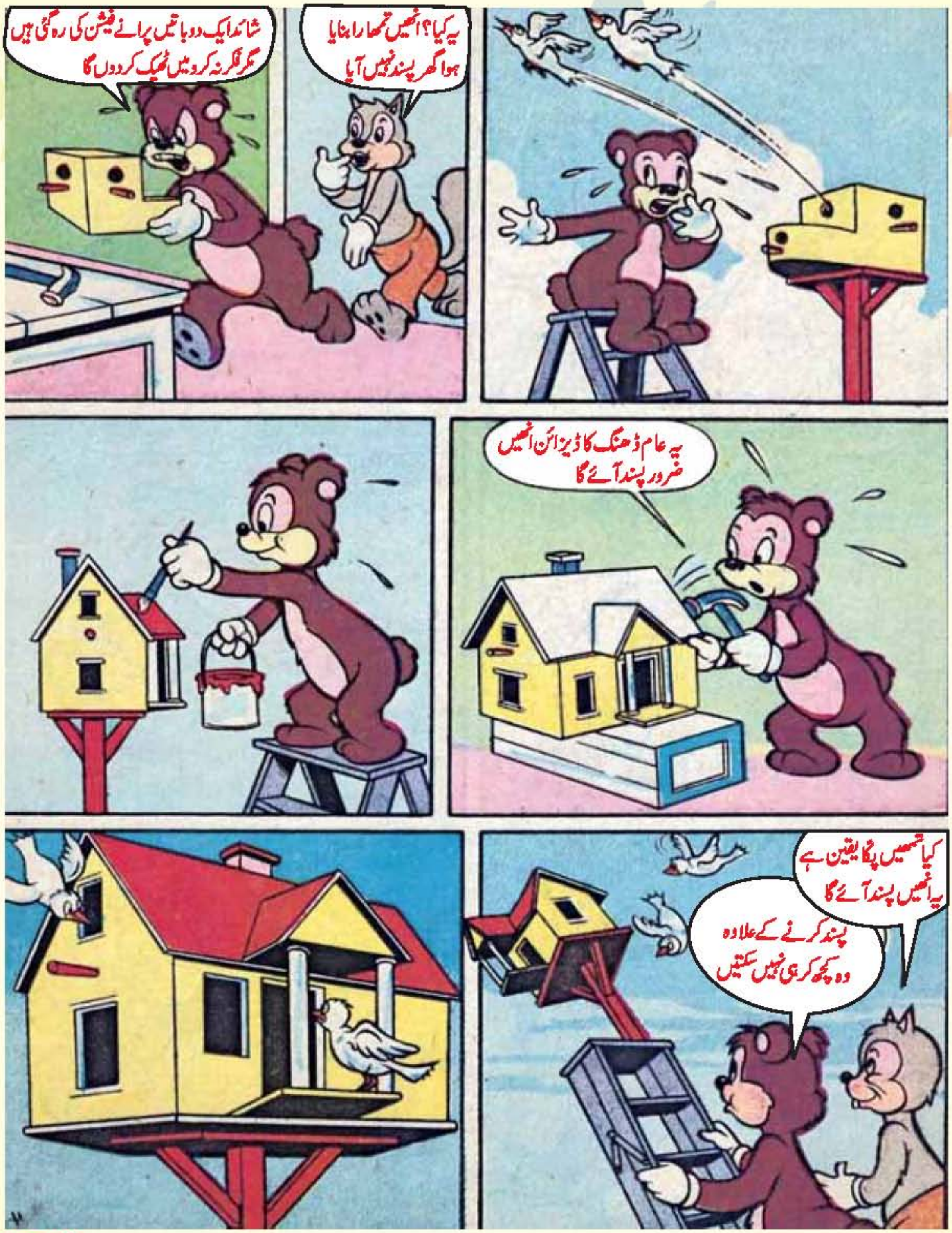
یہ کیا؟ انھیں تمھارا بنایا ہوا گھر پسند نہیں آیا
شائد ایک دو باتیں پرانے فیشن کی رہ گئی ہیں مگر فکر نہ کرو میں ٹھیک کردوں گا
یہ عام ڈھنگ کا ڈیزائن انھیں ضرور پسند آئے گا
کیا تمھیں پکا یقین ہے یہ انھیں پسند آئے گا
پسند کرنے کے علاوہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتیں

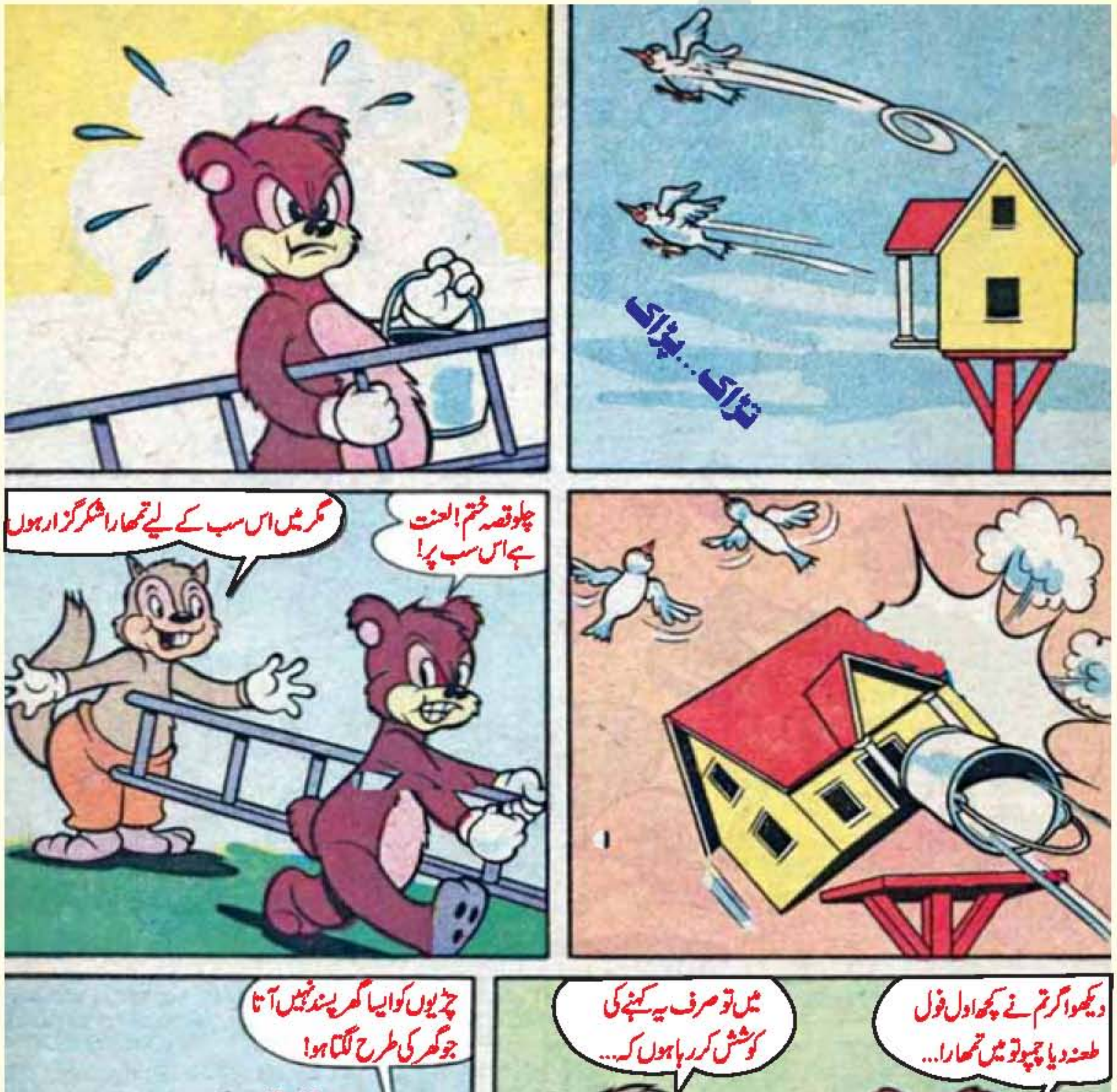

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

مصطفیٰ ندیم خاں غوری

ایک کلاس کھانے پینے کی

استاد جماعت میں داخل ہوتے ہیں بچے ادب سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔استاد کہتے ہیں سٹ ڈاون، تمام بچے بیٹھ جاتے ہیں استاد کہتے ہیں بچو آج ہم ایک بہت ضروری معاملے پر باتیں کریں گے۔آپ لوگ مل کر یا الگ الگ سوال کیجیے اور میرے سوالوں کا بھی جواب بھی اسی طرح دیں۔

استاد : صبح نیند سے جاگتے ہی آپ سب سے پہلے کیا کام کرتے ہیں؟

بچے : جی ٹائلٹ جاتے ہیں۔

استاد : اور اس کے بعد؟

بچے : برش کر کے نہا دھو کر تیار ہو جاتے ہیں۔

استاد : شاباش! اور تیار ہونے کے بعد کیا کرتے ہیں؟

بچے : ناشتہ کرتے ہیں۔

استاد : اور ناشتہ کیسے کرتے ہیں؟

بچے : جی کچھ کھاتے پیتے ہیں۔

استاد : بس تو آج ہم کھانے پینے کی ہی باتیں گے۔

استاد بورڈ پر چاک سے موٹے حروف میں 'ہماری غذا' لکھ دیتے ہیں۔اور سوال وجواب کے طریقے سے پڑھاتے جاتے ہیں، جہاں ضرورت ہو وہاں معنی مطلب سمجھا کر اہم لفظ بورڈ پر لکھتے جاتے ہیں اور زیادہ سمجھانے کے لیے تصویریں استعمال کرتے ہیں۔

استاد : بتایئے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو روتا کیوں ہے؟

بچے : جی اسے بھوک لگتی ہے۔

استاد : بچے کو جب بھوک لگتی ہے تو اسے کیا پلاتے ہیں؟

بچے : ماں بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہے۔

استاد : اسے کھانے کے لیے ٹھوس غذا یعنی روٹی کیوں نہیں دیتے؟

بچے : اُس کے دانت نہیں ہوتے اس لیے روٹی نہیں چبا سکتا۔

استاد : بالکل صحیح ہے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ ماں کا دودھ ایک مکمل غذا

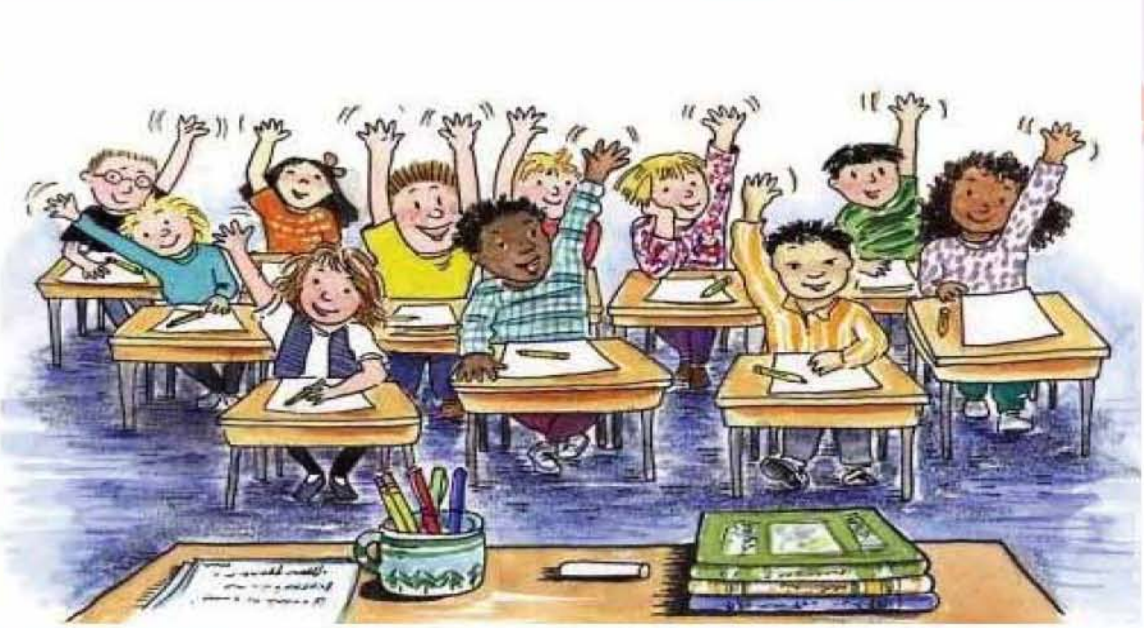

ہے اِس لیے اُسے کسی اور غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب یہ بتائیں کہ بچہ دودھ کو غذا کے طور پر کب تک استعمال کرتا ہے؟

بچے : دانت نکلنے تک۔

استاد : اس دوران کیا دودھ کے علاوہ بھی کوئی چیز لیتا ہے؟

بچے : جی ہاں دودھ کے علاوہ پتلا سا حلوہ، کھچڑی وغیرہ بھی کھالیتا ہے جنھیں چبانے کے لیے دانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

استاد : مگر یہ ننھے بچے اور بھی بہت کچھ کھاتے رہتے ہیں۔

بچے : جی ہاں۔ ہم نے دیکھا ہے وہ آس پاس پڑی چیزوں کو کھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

استاد : کیا آپ ان چیزوں کی کچھ مثالیں دے سکتے ہیں؟

بچے : جی ہاں مثلاً کانچ کی گولیاں، بوتلوں کے ڈھکن، سکے، جھنجھنا، کاپیوں کتابوں کے کونے وغیرہ وغیرہ۔

استاد : ان چیزوں سے تو بچے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پھر ان سے بچے کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟

بچے : ان چیزوں کو بچے سے چھین کر اس کی پہنچ سے دور رکھ دیں۔

استاد : تب تو بچہ چیخ چیخ کر ہنگامہ کردے گا تب کیا کریں؟

بچے : کوئی بڑا سا صاف ستھرا کھلونا اسے دے دیں جو اس کے منہ میں نہ جاسکے یوں اس کی آنکھوں میں آنسو تو رہیں گے لیکن وہ مسکرا کر کھلونے سے کھیلنے لگے گا۔

استاد : بچہ جب ایک سال سے زیادہ عمر کا ہوجائے تو کیا کھاتا ہے؟

بچے : ہلکی پھلکی غذا کے علاوہ فرصت میں دیواریں کھرچ کھرچ کر کھرچن یا مٹی کھانے لگتا ہے۔

استاد : وہ مٹی کیوں کھاتا ہے؟

بچے : ہم نے اسے مٹی تو کھاتے دیکھا ہے پر کیوں کھاتا ہے یہ اس نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔

باقی کلاس ہنستی ہے

استاد : وہ مٹی اس لیے کھاتا ہے کہ اس کی خوراک میں کیلشیم یعنی چونے اور آئرن یعنی لوہے کی کمی ہوتی ہے اور مٹی یا دیواروں سے اس کی کچھ ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ عادت پیٹ کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس کمی کو پوری کرنے کے لیے اسے کیا کھلائیں؟

بچے : جناب ایسی غذائیں تو ہم نے نہیں دیکھیں جن میں چونا یا لوہے کا برادہ ملایا جاتا ہو۔

باقی بچے پھر ہنستے ہیں

استاد : ایسی بات نہیں ہے دراصل یہ وٹامن کے ساتھ سبزیوں اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں میں شامل ہوتے ہیں، جیسے دودھ جو ایک مکمل غذا ہے۔اس میں کیلیشم کافی ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انڈے کی خوبی کے لیے کہا جاتا کہ دودھ کے بعد انڈے کا ہی نمبر ہے۔پالک تو لوہے کا خزانہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ بچے کو اگر دودھ انڈا اور پالک کی سبزی پابندی سے دیتے رہیں تو دیوار کھرچنے کی اس کی عادت جاتی رہے گی۔اس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے جسم کو جن وٹامنوں کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں وہی سبزیاں پسند آتی ہیں۔مثلاً گھر کے کسی فرد کو بھنڈی پسند ہے تو کسی کو میتھی، کسی کو گوبھی تو کوئی بیگن کھانا چاہتا ہے کسی کو آلو عزیز ہیں تو کسی کو ٹماٹر۔اب گھر کے لوگ پریشان کہ پکائیں تو کیا پکائیں۔اچھا اب یہ بتائیں کہ وٹامن کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟

بچے : جی ابھی تک تو ہم کچھ نہیں۔اب آپ جو کہیں گے کہہ دیا کریں گے۔

استاد : مذاق اچھا ہے لیکن یہ اردو کا معاملہ ہے اس لیے ذرا خیال رکھیں۔

وٹامن کو اردو میں حیاتین کہتے ہیں۔ اچھا بتاؤ وٹامن کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟

بچے : جناب وٹامن A، وٹامن B اور وٹامن C

استاد : ان میں وٹامن D اور وٹامن E بھی جوڑلیں اب بتائیں یہ کتنے قسم کے ہوتے ہیں۔

بچے : جی کل ملا کر پانچ وٹامن ہوگئے۔

استاد : (مسکرا کر) چلیے آپ کی گنتی کی پریکٹس ہوگئی۔اب یہ بتائیں کہ وٹامن A کن چیزوں میں ہوتا ہے؟

بچے : یہ ترکاریوں، اناج، دالوں، دودھ، پھل، ساگ سبزیوں میں ہوا کرتا ہے۔

استاد : شاباش۔ یاد رہے کہ ان سے دماغی بیماریوں کی روک تھام ہوتی ہے۔آنتوں کی خرابیاں دور ہوتی ہیں۔صاف خون پیدا ہوتا ہے، وزن بڑھتا ہے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔اسی طرح وٹامن D مچھلی کے تیل، دودھ، مکھن، چربی اور انڈے میں ہوتا ہے۔اس سے ہڈیاں بڑھتی ہیں۔وٹامن E گیہوں میں خوب کثرت سے ہوتا ہے اور دودھ پھل اور سبزیوں سے بھی ملتا ہے اور یہ جسم کو طاقت دیتا ہے۔اب یہ بتائیں کہ یہ غذائیں کتنی کھائی جائیں؟

بچے : اتنی جو آسانی سے ہضم ہوسکیں۔

استاد : یعنی نہ کم نہ زیادہ۔اتنی ہی کھائیں کہ کچھ بھوک باقی رہے۔ بچپن سے لے کر تیرہ سال کی عمر تک غذا بڑھتی جاتی ہے۔یہ تیرہ سال

جسم کی بناوٹ مکمل ہونے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اب بتاؤ کہ کھانا کیسے کھانا چاہئے؟

بچے :جی اگر ہر کام دائیں ہاتھ سے کرنے کے عادی ہیں تو دائیں ہاتھ سے کھائیں اور کھانے کو خوب چبائیں۔

استاد : بالکل صحیح کہا۔ بزرگ اور کمزور لوگ ٹیبل اور کرسی پر بھی کھا سکتے ہیں تا کہ اٹھنے، بیٹھنے میں دقت اور تکلیف نہ ہو۔ویسے فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانا زیادہ اچھا ہے۔اچھا!غذا کو کتنا چبانا چاہئے؟

بچے: اتنا کہ غذا کافی باریک ہوجائے اور ہضم کرنے کے لیے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔

استاد : شاباش! یہ وٹامن اور غذائیت سے بھرپور غذا کس عمر تک کھانی چاہئے؟

بچے : جی عمر بھر۔

استاد : بڑھاپے میں بھی؟

بچے : جی نہیں بڑھاپے میں شاید معدہ کمزور ہوجاتا ہے۔

استاد : بہت خوب!بڑھاپے میں کھانے کی احتیاط لازمی ہے۔سادہ ملی جلی اور کم غذا لیں۔مصالحہ دار اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔اب بتائیں کہ بوڑھوں کی غذا میں کون سی چیزیں شامل ہونی چاہئے؟

بچے :جی گیہوں کی چپاتیاں، سبزیاں، دالیں، دودھ پھل وغیرہ۔ لیکن جناب آپ کچھ مرغوں کے بارے میں بھی فرما رہے تھے۔

استاد : ایں!مرغے؟ وہ اچھا۔اچھا(اونچی آواز میں) مرغن (پھر تقریباً چیختے ہوئے) مرغن۔

بچے :(سہم کر) وہ کیا ہوتا ہے؟

استاد : لیجئے!وہ کیا ہوتا ہے۔کبھی پراٹھا یا روغنی روٹی چکھی ہے؟

بچے :جی کھائی ہے۔

استاد : اوپر سے کیسے ہوتی ہے؟

بچے :جی اس پر چکنائی لگی ہوتی ہے۔

استاد : اس چکنائی یا تیل کو روغن کہتے ہیں۔پھر جس غذا میں روغن یعنی تیل چکنائی زیادہ ہو اسے مرغن ہی کہیں گے نا۔اس کا مرغے سے

کوئی تعلق نہیں۔سمجھ گئے؟

بچے :جی ہاں!

استاد : شکر ہے سمجھ گئے۔اب یہ بتائیں کہ کھانے کے فوراً بعد کیا کرتے ہیں۔

بچے :جی ہاتھ دھو لیتے ہیں۔

استاد :اور ہاتھ دھونے کے بعد کیا کرتے ہیں؟

بچے :جی پانی پیتے ہیں۔

استاد :پانی کتنا پینا چاہئے؟

بچے :جتنی ضرورت ہو۔

استاد :بالکل صحیح۔میں آپ کو بتادوں کہ روزانہ صبح نہار منہ پابندی سے دو گلاس تازہ اور صاف ستھرا پانی پیتے رہیں تو یہ صحت کو ٹھیک رکھنے کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ اس سے جسم کے زہریلے مادے خارج ہوجاتے ہیں۔دل کی دھڑکن نارمل ہوتی ہے۔گردے کی پتھری خارج ہوجاتی ہے۔اس کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر، شوگر اور ٹی بی کی شکایتیں دسور ہوجاتی ہیں۔ خیال رہے کہ دوپہر یا شام کا کھانا اسی وقت کھایا جائے جب کہ پہلے کھائی ہوئی چیزیں ہضم ہوچکی ہوں اور جب تیز بھوک لگنے لگے۔سمجھ گئے؟

بچی:جی جناب!

استاد:اچھا بھئی اب، آج کی کلاس ختم!□

Mr Mustafa Nadeem Khan Ghauri 3-10/7405/54/4 Zarina Manzil Vrinda Van Colony Old Jalna -431213 Mah

□ پریم دھون

ایک غریب الوطن کا نغمہ

اے مرے پیارے وطن
اے مرے بچھڑے چمن
تجھ پہ دل قرباں
تو ہی میری آرزو
تو ہی میری آبرو
تو ہی میری جاں

تیرے دامن سے جو آئیں ان ہواؤں کو سلام
چوم لوں میں اس زباں کو جس پہ آئے تیرا نام
سب سے پیاری صبح تیری سب سے رنگیں تیری شام
تجھ پہ دل قرباں

ماں کا دل بن کے کبھی سینے سے لگ جاتا ہے تو
اور کبھی ننھی سی بیٹی بن کے یاد آتا ہے تو
جتنا یاد آتا ہے تو مجھ کو اتنا تڑپاتا ہے تو
تجھ پہ دل قرباں

چھوڑ کر تیری زمیں کو دور آ پہنچے ہیں ہم
پھر بھی ہے یہ ہی تمنا تیرے ذرّوں کی قسم
ہم جہاں پیدا ہوئے ہیں اس جگہ ہی نکلے دم
تجھ پہ دل قرباں

تو ہی میری آرزو
تو ہی میری آبرو
تو ہی میری جاں
اے مرے پیارے وطن
اے مرے بچھڑے چمن
تجھ پہ دل قرباں

سید لطف اللہ گورکھپوری

نواب شعادت خاں

نواب سعادت خاں کے علاقوں کی چوہدی کا علم ان کے ضلع دار کو رہا ہو تو ہو، خود نواب سعادت کو پتہ نہ تھا کہ وہ کتنے گاؤں کے مالک ہیں اور ان کے تال تلیا اور باغات کی تعداد کیا ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں۔ وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ ان کی ریاست سے ہونے والی آمدنی کا ماہوار اوسط کیا ہے۔

اتنے بڑے علاقے کی دیکھ بھال اور اس کے انتظام کے لیے بہت سے ملازمین، منشی، امین، کلرک اور اکاؤنٹینٹ تھے، جو مہینے بھر بڑی ایمانداری سے اپنے اپنے فرائض انجام دیتے۔ نواب چین کی بنسی بجاتے اور عیش کرتے۔ اپنے ذاتی معاملات میں مدد کے لیے وہ اپنے پرائیویٹ سکریٹری کی مدد کے محتاج تھے، کیونکہ بدقسمتی سے علم کی دولت سے محروم تھے۔

اس کی کئی ایک وجہیں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ دوسری یہ کہ بچپن سے جوانی تک لگاتار پیچھے لگی رہی بیماریوں کی وجہ سے ان کی دماغی نشوونما قدرتی عمل کے مطابق نہ ہو سکی تھی اور تیسری یہ کہ اس زمانے میں ایک نواب زادے کا لکھا پڑھا ہونا اتنا ضروری بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، چنانچہ خود سے متعلق لکھنے پڑھنے کا کام انہیں اپنے پرائیویٹ سکریٹری سے لینا پڑتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ نواب کے سکریڑی نے خود کو کسی روز نواب سعادت سے کم نہ جانا تھا۔

سکریٹری کی یہ مغروریت کسی اور کو پسند رہی ہو یا نہ رہی ہو۔ مگر قاضی مختار حسن کے لئے یہ گویا ایک دیمک تھی۔ جو اُن کے ذہن کو چاٹے جا رہی تھی۔ انہوں نے کئی بار چاہا کہ سکریٹری کی شکایت کسی اور طرح نواب سے کریں، مگر ہمت نہ ہوئی کہ کہیں نواب اس کا برا نہ منائیں۔ وہ نواب کے بچپن کے دوست تھے اور ان کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے۔

نواب بھی قاضی مختار حسن کی عزت کرتے اور ان سے ایک دن کی جدائی برداشت نہ کرتے تھے۔ قاضی مختار حسن بھی نمک کا حق ادا کرتے اور نواب کو خوش کرنے اور ان کی دل جوئی میں آگے آگے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نواب کے سارے ملازمین ان کی عزت کرتے اور ڈرتے، کیونکہ قاضی مختار حسن کو ناراض کرنا گویا نواب سے دشمنی مول لینا تھا، یہ سب ہوتے ہوئے بھی سکریٹری نے کبھی قاضی صاحب کو سلام تک کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ قاضی انگاروں پر لوٹتے اور اپنے غم میں تنہا جلتے۔

ایک دن نواب کے سکریٹری نے قاضی کی چھڑی سے چھپکلی مار کر ان کی چھڑی کو ناپاک کردیا۔ بس قاضی تڑپ کر ہی تو رہ گئے۔ یہ ان کی کھلی توہین تھی۔ ان کی رگیں تن گئیں۔ دماغ نے قلابازی کھائی اور آنکھیں چمک اٹھیں، جیسے بجلی کا بٹن دب جائے اور کوئی قمقمہ روشن ہوجائے۔

وہ فوراً نواب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے''حضور! اب تو آپ کے اس خادم سے یہ توہین برداشت نہیں ہوتی۔''

''توہین؟'' نواب چونک کر بولے''کس کی توہین؟''

''حضور کی توہین! نواب سعادت علی خاں بلند اقبال کی توہین۔''

''قاضی!'' نواب گرجے''نواب سعادت کی توہین! کیا کہتے ہو؟''

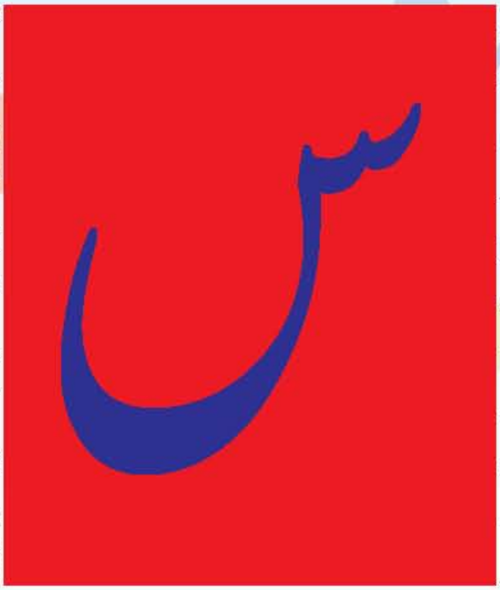

''جی ہاں حضور! سچ کہتا ہوں'' قاضی اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولے''وہ جو حضور کا سکریٹری ہے نا، وہ حضور کا نام چھوٹی سین سے لکھتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ یہ گستاخی ہے اور حضور کا نام بڑی شین سے لکھا جانا چاہئے، مگر جب وہ حضور کے رتبے کو کچھ سمجھتا ہو تب نا! وہ تو خود ہی کو نواب سمجھ بیٹھا ہے اور جو اس کے جی میں آتا ہے وہی کرتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں حضور کہ اگر وہ آپ کا نام بڑی شین سے لکھے تو اس کا کیا بگڑ جائے گا۔ مگر جب وہ حضور کے خاندانی وقار ہی سے واقف نہیں تو اسے سمجھایا کس طرح جائے۔''

''ہوں!'' نواب پھنکارے''تو اس کی یہ مجال...؟''

''جی ہاں حضور! آپ کے اس نمک خوار نے اسے کئی بار سمجھایا کہ بھائی چھوٹی سین سے چھوٹے آدمیوں کے نام لکھے جاتے ہیں اور بڑی شین بڑے آدمیوں کے ناموں میں لگتی ہے، لیکن وہ تو حضور کے خاندانی وقار ہی سے نہیں واقف، پھر وہ حضور کے رتبے کو کیا سمجھے۔''

''بس بس!'' وہ گویا قاضی کو خاموش کرتے ہوئے بولے''میں ابھی اسے اپنے رتبے سے واقف کراتا ہوں۔ اسے بلایا جائے۔''

حکم سنتے ہی سکریٹری حاضر تھا!

نواب کا غصہ دیکھ کر وہ کانپ گیا۔

''کیوں بے نمک حرام تو میرا نام کس سین سے لکھتا ہے؟''

''اسی سین سے حضور'' سکریٹری ممیایا''جو

حضور کے نام نامی میں لگنی چاہئے۔"

"حضور کے بچے!" نواب دہاڑے "نام نامی میں لگنی چاہئے یا نہیں، میں تو صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ وہ چھوٹی سین ہے یا بڑی شین، جس سے تو میرا نام لکھتا ہے؟"

"حضور!" سکریٹری اس کے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔

"قاضی!" نواب نے اپنے قریب کھڑے قاضی مختار حسن کو اتنی زور سے پکارا جیسے کہیں وہ بہت دور کھڑے ہوں۔ "قاضی مختار حسن!

اس نمک حرام سکریٹری کو میرے علاقوں سے دس میل باہر نکال آؤ، ورنہ ابھی ٹانگیں چروادوں گا اس کی کھڑے کھڑے۔"

نواب اتنے تنگ دل کبھی نہ تھے، مگر چونکہ عزت کا معاملہ تھا، اس لیے خاموش کیسے رہ سکتے تھے اور پھر سیدھے اتنے کہ ایک بچہ بھی انہیں بہکا سکتا تھا۔ غرض یہ کہ اب سکریٹری صاحب کا قلمدان قاضی مختار حسن کے ہاتھوں آ گیا اور نواب سعادت، شعادت خاں بن گئے۔

قاضی کے دل کو ٹھنڈک پڑی کہ آخر کار اتنے دنوں بعد اب ان کے بھی دن آ گئے تھے۔

اُدھر سکریٹری کو اپنے پیچھے دن یاد آئے۔ نواب کی محبت اور ان کی مہربانیاں یاد آئیں۔ عیش کے دن تو پر لگا کر اڑ گئے اور اپنے پیچھے اس دن کے لئے بہت سی مصیبتیں اور تنہائیاں چھوڑ گئے۔ اب کیا ہوگا؟ زندگی کیونکر کٹے گی؟

آخر ایک دن سکریٹری کے دماغ میں بھی ایک قمقمہ روشن ہوا، گویا قسمت کا ایک ستارہ چمکا، جو اپنی رہنمائی میں اسے نواب کی حویلی تک لے گیا۔ نواب دل کے برے نہیں تھے۔ انہوں نے سکریٹری کو ملنے کی اجازت دے دی۔

سکریٹری نے بڑے ادب سے سلام کیا اور ان کے تئیں اپنی احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ نواب پسیج گئے بولے "دن کیسے کٹے؟"

"دن کیسے کٹتے؟" سکریٹری نے غمگین لہجے میں کہا "بھلا کوئی بیٹا اپنے مشفق باپ سے، کوئی ضرورت مند اپنے مہربان سرپرست سے جدا ہو کر خوش بھی رہ سکتا ہے؟ جس بدنصیب کے اوپر سے حضور کی نگاہ اٹھ جائے، اس کا حال یا تو وہ خود جان سکتا ہے یا اس کا خدا جو عالم الغیب ہے اور ہر ایک کے اندر اس کے دل میں موجود ہے۔"

"تو کیا چاہتے ہو؟" نواب کی فراخ دلی بولی۔

"میں حضور کی نظر میں لاکھ نالائق سہی، مجھے یہ بھی تسلیم کہ میں نے حضور کا نام چھوٹی سین سے لکھا، لیکن میں نے حضور کی عنایات سے پرورش پائی ہے تو قاضی صاحب کی طرح گستاخ بھی نہیں ہوسکتا کہ

حضور کا نام اس شین سے لکھوں جس چیز سے کوئی حرام شے بھی لکھی جاتی ہو۔"

"یعنی" نواب صاحب کی مونچھیں ہلیں "میرا نام شراب والی شین سے لکھتا ہے؟"

"صرف اتنا ہوتا حضور تو کوئی بات نہ تھی" سکریٹری نے ایک اور تیر کمان پر چڑھایا" وہ تو کہیے کہ مجھے ان کی سازش کا پتہ چل گیا ورنہ دھوکے میں شراب پلاکر وہ جائدادیں اپنے نام کروانے والے تھے۔"

"اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے عین موقعے پر میری مدد کی۔"

"جی حضور" سکریٹری نے حامی بھری۔

"ابھی بلاتا ہوں" اور زور سے چیخے "قاضی مختار حسن! او قاضی مختار حسن!!"

اور قاضی مختار حسن دوڑتے ہوئے آئے، "فرمایئے حضور!" لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر حواس کھو بیٹھے۔

"آپ میرا نام کس شین سے لکھتے ہیں قاضی صاحب؟"

"جی حضور کا اقبال بلند رہے بڑی شین سے۔" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ سکریٹری نے دیکھا اس کی بندوق کے سامنے آیا ہوا شکار کتنا کمزور ہے۔

"میں بڑی شین اور چھوٹی سین کچھ نہیں جانتا۔" ان کی آواز گونجی "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ شراب والی ناپاک شین سے میرا نام لکھتے ہیں؟"

"جی؟" یہ جی انہوں نے اس طرح کہا جیسے کچھ نہ سمجھے ہوں۔

"میں پوچھنا چاہتا ہوں" نواب آپے سے باہر ہو گئے۔ "آپ میرا نام شراب والی شین سے لکھتے ہیں؟ شرم نہیں آتی آپ کو۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ نکل جایئے ابھی اور میرے علاقوں میں بھی دکھائی نہ دیجئے گا کبھی۔ رستم! ابے او رستم خاں۔ ارے اب کھڑا کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ نکال باہر کر انہیں

میری حویلی سے اور دیکھ ان کا سایہ بھی کبھی میرے علاقوں میں دکھائی دے تو ٹانگیں چیر کر پھینک دینا ان کی۔"

اور قاضی مختار حسن نے محسوس کیا کہ ان کی عزت کرنے والے رستم خاں کے ہاتھوں میں ان کی گردن کی گرفت کتنی سخت ہے!! اور نواب شعادت اب پھر سعادت خاں بن گئے۔ □

Syed Lutfullah
Sangi Masjid Sheikhpur Gorakhpur- 273005 UP

□ رجب علی بیگ سرور

5

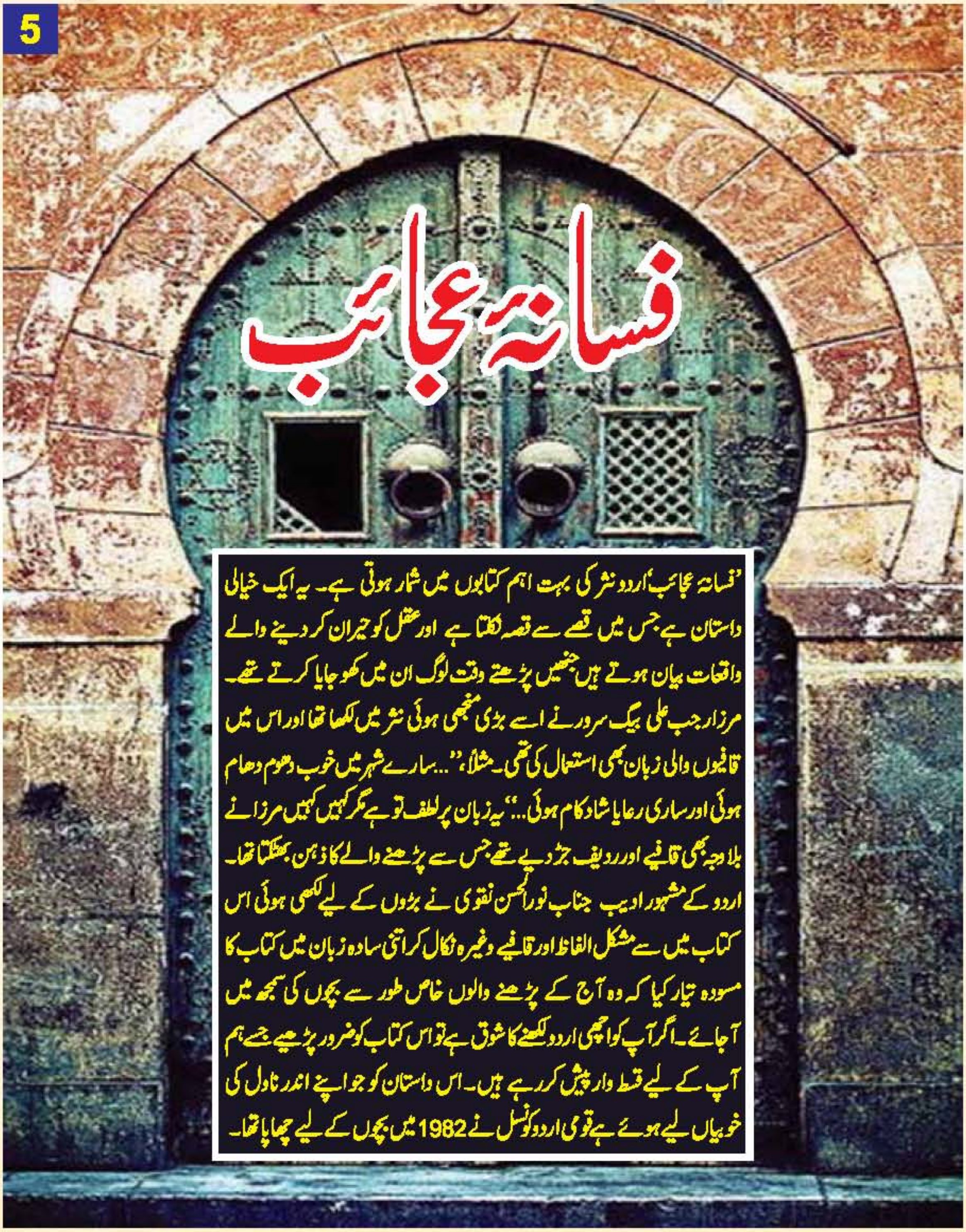

فسانۂ عجائب

'فسانۂ عجائب' اردو نثر کی بہت اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک خیالی داستان ہے جس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات بیان ہوتے ہیں جنھیں پڑھتے وقت لوگ ان میں کھو جایا کرتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اسے بڑی منجھی ہوئی نثر میں لکھا تھا اور اس میں قافیوں والی زبان بھی استعمال کی تھی۔ مثلاً، "...سارے شہر میں خوب دھوم دھام ہوئی اور ساری رعایا شادکام ہوئی..." یہ زبان پر لطف تو ہے مگر کہیں کہیں مرزا نے بلا وجہ بھی قافیے اور ردیف جڑ دیے تھے جس سے پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب جناب نورالحسن نقوی نے بڑوں کے لیے لکھی ہوئی اس کتاب میں سے مشکل الفاظ اور قافیے وغیرہ نکال کر اتنی سادہ زبان میں کتاب کا مسودہ تیار کیا کہ وہ آج کے پڑھنے والوں خاص طور سے بچوں کی سمجھ میں آ جائے۔ اگر آپ کو اچھی اردو لکھنے کا شوق ہے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے جسے ہم آپ کے لیے قسط وار پیش کر رہے ہیں۔ اس داستان کو جو اپنے اندر ناول کی خوبیاں لیے ہوئے ہے قومی اردو کونسل نے 1982 میں بچوں کے لیے چھاپا تھا۔

اس داستان میں شہزادہ جان عالم اور ملک زر نگا رکی شہزادی انجمن آرا کی محبت کا قصہ بنیادی قصہ ہے جس میں سے کئی اور دل چسپ قصے اور پھر ان میں‌سے بھی کئی قصے پھوٹ نکلتے ہیں۔

اب تک آپ نے پڑھا : کسی زمانے میں، ملک ختن میں ایک بادشاہ تھا فیروز بخت۔ شہزادہ جان عالم اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ ایک دن شہزادے نے ایک طوطا باز ر سے خریدا جو بولتا تھا۔ یہ طوطا بڑا عقل مند اور عالم تھا۔ وہ دنیا بھر کی باتیں شہزادے کو بتایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ملک زرنگار کی ملکہ انجمن آرا کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔نو جوان شہزادہ بنا دیکھے ہی ملکہ پر عاشق ہوکر اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں طرح طرح کی پریشانیاں آئیں۔ایک جگہ غلطی سے ایک جادوگرنی کے جال میں پھنس گیا جو اسے اپنے محل لے گئی اور کہنے لگی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جان عالم نے انکار کردیا اورایک دن اس کی طلسمی قید سے نکل آیا۔ راستے میں اسے ملکہ مہر نگاراپنی خواصوں کے ساتھ ملی اور گھر لے گئی۔ ملکہ نے جان عالم کا پورا قصہ سن کر اسے اپنے والد سے ملا یا جو بادشاہت چھوڑکر عبادت گزار بن چکے تھے۔ انہوں نے جان عالم کو بہت سی دعا ؤں کے ساتھ ایک لوح بھی دی جو دراصل خدا کے ناموں کا ایک تعویذ تھی اور ہرجادو کوتوڑدیتی تھی ۔مہر نگار اوراس کے والد سے رخصت ہو کر جان عالم ، انجمن آرا سے ملنے اس کے ملک زرنگار کی طرف چل پڑا۔وہاں پتہ چلا کہ انجمن آرا ایک جادوگر کی قید میں ہے اور پورا ملک سوگ میں ڈوبا ہے۔ یہ سنتے ہی شہزادہ جادوگر سے لڑنے چلا اورلوح کی مدد سے کامیاب رہا۔انجمن آرا کی واپسی پر اس کا باپ جو کہ ملک کا بادشاہ تھا اس قدر خوش ہوا کہ اس نے جان علم سے انجمن آرا کی شادی کردی۔کچھ دن سب ٹھیک رہا مگر پھر جان عالم کو گھر کی یاد ستانے لگی بادشاہ اس سے بہت محبت کرنے لگا تھا لیکن آخر کاراسے جان عالم کوجانے کی اجازت دینی پڑی جس کے بعد بڑے اہتمام سے اسے اور انجمن آرا کوخصست کیاگیا۔اب آگے پڑھیے :

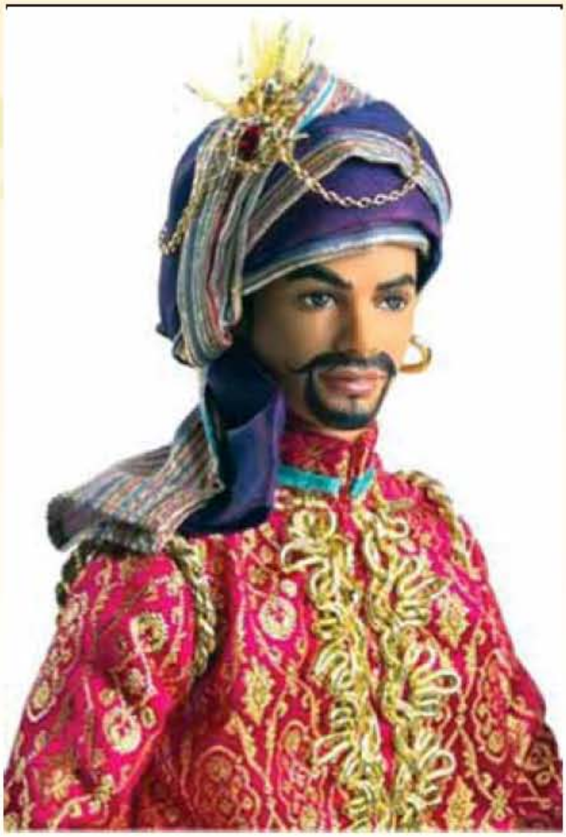

شہزادہ شہزادی کی روانگی

جان عالم اور انجمن آرا کے سفر کی تیاریاں زور وشور سے ہوتی رہیں یہاں تک کہ رخصت کا وقت قریب آ پہنچا۔ اگلی صبح کو دونوں روانہ ہونے والے تھے۔ بادشاہ کا غم سے برا حال تھا۔ شام کو بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو ساتھ لیا اور شہر سے دوکوس دور چلا گیا۔ یہاں سڑک کے قریب ایک اونچا سا پہاڑ تھا اس پر جا بیٹھا۔ وزیر سے کہا ”تم شہزادے کو رخصت کرو، ہم یہاں سے جلوس، سواری اور سامان سفر دیکھ لیں گے۔“ اہل شہر نے یہ سنا تو کیا عورت، کیا مرد، کیا جوان، کیا بوڑھا اور کیا بچہ سب کے سب دوسری پہاڑی پر جمع ہوگئے۔

جھٹپٹے کے وقت جان عالم نے سواری طلب کی، ہرکاروں نے بادشاہ کو خبر پہنچائی، وہ سڑک کی طرف متوجہ ہوا۔ ذرا دیر میں روشنی نظر آئی، سجی سجائی پلٹنیں گزریں، توپ خانہ گزرا۔ اس کے بعد سواری کے

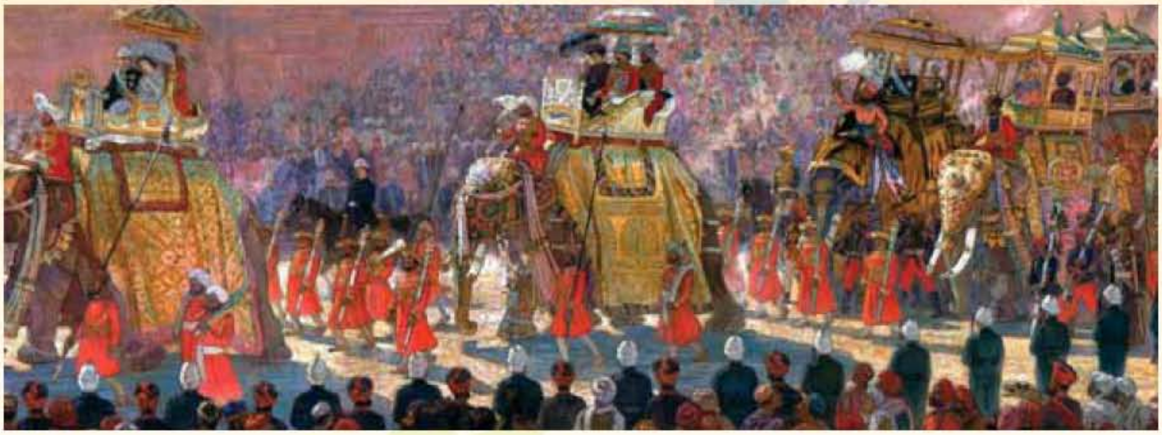

بارہ ہزار ہاتھی تھے جن پر ہووج اور عماریاں کسی تھیں۔ اس کے پیچھے ہزار بارہ سو جنگی ہاتھی تھے۔ ان کی سونڈوں میں بان پٹے چڑھے تھے، سونے چاندی کی زنجیریں کھنک رہی تھیں۔ ان کی جھولیں زربفت کی تھیں اور ہیکلیں کلابتوں کی۔ فیل بان کمخواب کی وردیاں پہنے، جوڑے دار پگڑیاں باندھے، کمر میں کٹار کسے اور ہاتھوں میں جڑاؤ گج باگ لیے ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔

ہاتھیوں کے پیچھے کئی لاکھ سواروں کے پرے تھے۔ ہر جوان کی عمر بیس اکیس برس کی تھی۔ ہر ایک کے بدن پر زرہ بکتر جوشن تھی، دونوں بازوؤں پر جوشن چڑھے تھے، ہاتھوں میں فولادی دستانے اور سروں پر خود یعنی لوہے کی ٹوپیاں تھی۔ مطلب یہ کہ سارے سوار لوہے سے ڈھکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھاری تلواریں اور خنجر تھے۔ تیغے، قرولی، کٹاریں کمروں میں کسی ہوئی تھیں اور ہر ایک کی پیٹھ پر ڈھال سجی تھی۔ ہر سوار جوانی کے نشے میں مست اور اپنی طاقت پر مغرور تھا۔

سانڈنی سوار الگ اپنی سج دھج دکھا رہے تھے، ان کے جسموں پر زرد لباس اور سروں پر سرخ پگڑیاں تھیں، ٹانگوں میں آبی باغات کے پاجامے تھے۔ سانڈنی سوار ہتھیار لگائے، ہاتھوں میں مہار اٹھائے اکڑتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سانڈنیوں کی چھم چھم سے عجب سماں نظر آتا تھا۔

اب سواری کے خاصے نظر آئے، عربی، ترکی، تازی، عراقی، یمنی گھوڑے قطار در قطار تھے۔ ہر گھوڑا نرالا، ایک سے ایک البیلا، کسی پر جڑاؤ زین بندھا، کسی پر چار جامہ کسا۔ ساتھ ساتھ نوبت شان، غرض جلوس کی عجب شان تھی۔ میر شکار بھی شکار کا سامان لیے ساتھ تھا۔ باز، بحری، باشے، شاہین، عقاب اور طرح طرح کے شکاری پرندے، شکاری کتے، چیتے، سب میر شکار کے ساتھ تھے۔ سقے کھاروے کی لنگیاں پہنے شانوں پر بادلے کی جھنڈیاں لیے، مشکوں میں بید مشک بھرے ہزارے کے فوارے سے چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے۔

بادلہ پوش غلام ہاتھوں میں ہیرے کے کپڑے پہنے سونے چاندی کی انگیٹھیوں میں خوشبوئیں جلاتے تھے اور سارا جنگل خوشبو میں بستا جاتا تھا۔ ان کے برابر دو ہزار کم عمر لڑکے بلور کی صاف شفاف لالٹینیں لیے، مومی اور کافوری شمعیں روشن کیے ساتھ تھے۔ عجب سماں تھا کہ سورج نے مشرق کی کھڑکی سے سر نکالا۔ شاید اسے ابھی اس نرالی سج دھج کا جلوس دیکھنے کا اشتیاق ہوا ہو۔ غرض یہ کہ صبح نمودار ہوئی۔ پھولوں کے کھلنے سے سارا علاقہ معطر ہو گیا۔

اب خاصہ برداروں کا غول نظر آیا، کم خواب کی مرزائیاں، گجراتی انگرکھے، مشروع کے گھٹنے، پاؤں میں دلّی کی ناگوری جوتیاں، سر پر گلنار پگڑیاں، لڑکیوں کی چھب الگ دیکھنے کے لائق تھی، زربفت کے لہنگے، مسالہ ٹکے ململ کے دوپٹے، باریک بنت گوکھرو کی کرتیاں، ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے، پیروں میں سونے کے کڑے، کانوں میں

بالیاں، گرداگرد بیچ میں شہزادہ جان عالم، برابر میں انجمن آرا کا سکھپال جسے خوب صورت کہاریاں اٹھائے ہوئے تھیں، ترکنیں حفاظت کے لیے ساتھ تھیں، خواجہ سرا انتظام میں مشغول تھے۔

جب یہ شان دار جلوس نزدیک پہنچا تو بادشاہ نے بڑی حسرت سے دیکھا اور سرد آہ بھری۔ بے قراری بڑھ گئی، جان عالم گھوڑے سے کود کر تسلیمات بجا لایا۔ بادشاہ کا اس وقت دل پر قابو نہ تھا۔ اس نے شہزادہ کو قسم دے کر کہا ''اس وقت ہمارے پاس نہ آؤ، جاؤ تمہیں خدا کو سونپا۔''

مجبوراً شہزادہ مجرا کر کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ جب جان عالم نے گھوڑا بڑھایا، ساری خلقت کا جی بھر آیا، بادشاہ کی بے قراری، شہزادی شہزادے کی گریہ وزاری کسی سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ سب زار و قطار روتے تھے، اپنا جی کھوتے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر فریاد تھی کہ ''آج شہر کی رونق رخصت ہوئی، ان دونوں کی جدائی کیسے برداشت ہوگی، شہر ویران ہوجائے گا۔''

کہتے ہیں سیکڑوں مرد عورت بغیر کچھ کہے ساتھ ہوگئے۔ اپنی مرضی سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اس قافلے کے پیچھے شہزادی کی سہیلیوں، امیر زادیوں کی پالکیاں، نالکیاں اور چنڈول تھے۔ پیش خدمتیں میانوں میں سوار تھیں۔ آتوں اور مغلانیاں رتھوں میں بیٹھی چلی جاتی تھیں۔ لونڈیاں، باندیاں، انا چھوچھو، دو برجے اور سائبان میں سوار تھیں، خزانے اور سامان کے لیے چھکڑے اور اونٹ گاڑیاں تھیں۔

بتانے والے بتاتے ہیں کہ امام ضامن کے روپے اور اشرفیاں اتنی آئیں کہ تمام راستے مسافروں نے پائیں۔ کھجور کلچوں کا یہ حال ہوا کہ راتب کے سوا ہاتھوں کو کلچے ملے۔ کھجوریں جو بٹ نہ سکیں، راستے میں پھینک دیں، وہ اگیں اور ان درختوں سے جنگل ہوگیا۔

ہاں تو جب قافلہ سدھار گیا تو بادشاہ حال اور بدحواس محل کو لوٹا۔ بسا بسایا شہر لٹا اجڑا اور ویران نظر آیا۔ بازار میں چراغ گل پائے، جس طرف دیکھا تھکے ماندے پھر کر پڑے تھے۔ بازار میں تخت لگے ٹٹر جڑے تھے، دکانیں بند تھیں، ساری رعایا اداس تھی، جو جہاں پڑا تھا شہزادے کی رخصت کا ذکر کر رہا تھا، کوئی سوتا تھا، کوئی چپکا پڑا روتا تھا، بستی سنسان، بازار میں سناٹا، بادشاہ کو دونا قلق ہوا۔ محل سرا میں پہنچا تو وہاں بھی سب کو غم گیں پایا۔ انجمن آرا کی ماں کی نظروں میں دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ نہ ہلتی جلتی تھی، نہ بولتی چالتی تھی، قسمت پر اختیار نہ تھا، ہاں آنکھوں پر اپنا زور چلتا تھا، روئے جاتی تھی، بادشاہ نے سمجھایا، ہاتھ منہ دھلوایا اور خوشامدیں کر کے کچھ کھلایا۔

شہزادہ شہزادی کا قافلہ کوچ پر کوچ کیے چلا جاتا تھا، قافلہ کیا تھا پورا ایک شہر تھا، جہاں پڑاؤ ڈال دیتے پوری نگری آباد ہوجاتی، دکانیں سج جاتیں، بازار لگ جاتے، دنیا کی کوئی چیز نہ تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔

مہر نگار سے دوبارہ ملاقات

جب یہ قافلہ ملکہ مہر نگار کے باغ کے پاس پہنچا تو خبرداروں نے ملکہ کو خبر پہنچائی کہ لو مبارک ہو شہزادہ پھر سے تشریف لایا۔ شہزادے کی جدائی میں اس کا دل اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ یہ خوش خبری نہ سہہ سکی۔ سنتے ہی غش کھا کے گری، ہوش آیا تو بولی ''لوگو! یہ کیا کہتے ہو، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ سویا ہوا مقدر یوں جاگ اٹھے؟ تم سب میرا دل بہلانے کو ایسی باتیں کرتے ہو۔''

اتنے میں مہر نگار کی خواص دل آرام بارہ دری سے نیچے اتری اور کہنے لگی ''خدا جانے یہ لشکر کہاں سے آ کے یہاں اترا ہے۔'' ملکہ نے سن کے ٹھنڈی سانس بھری اور سیر کے بہانے خواصوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے کوٹھے پر چڑھی، دیکھا کہ سچ مچ ایک بھاری لشکر آ کے اترا ہے، دور تک شاہی خیمے گڑے ہیں اور فوجیں پڑی ہیں، سوار پیادے

ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔

شہزادی کی نظری ادھر ادھر سیر کرتی رہیں، اچانک شہزادہ جان عالم پر نظر پڑی، وہ ایک شان دار گھوڑے پر سوار تھا، دونوں طرف کئی کئی سوار تھے، مہر نگار نے پہلے اسے تھکا ہارا، مسافر کا مارا دیکھا تھا۔ آج اس شان سے نظر آیا تو اور بھی حسین لگا۔ ملکہ کا بدن کپکپانے لگا، قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑے مگر سنبھل گئی اور چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی۔

شہزادہ گھوڑے سے اتر کے سیدھا ملکہ کے والد کے پاس پہنچا اور سلام بجالایا۔اس بزرگ نے دعائیں دیں اور گلے سے لگا کے بولا "پاک پروردگار کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں خوش وخرم اور خیریت کے ساتھ دکھایا۔" اس کے بعد انجمن آرا کی سواری آئی، اس نے بھی تسلیم کی، اس بزرگ نے جواب میں کہا "شہزادی، جیتی رہو، خدا تمہاری عمر میں برکت دے، تم نے فقیر کے حال پر رحم کیا۔"

اس نے عرض کیا "کنیز مدت سے آپ کی تعریف سنتی تھی، دل میں آپ کے قدم چومنے کی خواہش تھی، آج شہزادے کی بدولت حاضری نصیب ہوئی۔"

شہزادی دو گھڑی اس بزرگ کی خدمت میں بیٹھی، پھر عرض کیا کہ "ملکہ سے ملاقات کا بہت اشتیاق ہے اگر اجازت ہو تو ان سے ملاقات کروں۔" انہوں نے کہا "شوق سے، تمہارا گھر ہے، اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔"

جان عالم تو اجازت لے کر اپنے خیمے میں آ گیا۔ انجمن آرا ملکہ مہر نگار سے ملنے چلی گئی، وہاں پہلے سے اس کے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی، اور ذرا دیر میں اجڑا ہوا مکان سج بن کے استقبال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

انجمن آرا کی سواری اتری تو ملکہ استقبال کو بڑھی اور جھک کے آداب بجالائی۔ انجمن آرا نے گلے لگایا، ملکہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی "تم نے مجھے شرمندہ کیا، میں فقیر کی بیٹی تم شہزادی، تمہارے قدموں نے اس مکان کی عزت بڑھائی ورنہ میں اس قابل کہاں تھی کہ تم میری مہمان ہوتیں۔"

انجمن آرا بولی "ملکہ، تم بھی خوب باتیں کرتی ہو، ہمارا تمہارا تو برابری کا رشتہ ہے، بلکہ ایک معاملے میں تم ہم سے بڑھ کے ہو، شہزادے سے تمہاری ملاقات ہم سے پہلے ہوئی، ہم تو دوسرے نمبر پر ہیں۔" غرض دونوں میں خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ نوک جھونک ہوتی رہی، ساری رات باتوں میں گزر گئی، دن نکلا تو انجمن آرا جان عالم کے پاس آئی اور دیر تک مہر نگار کی عادتوں کی تعریف کرتی رہی۔

دوسرے دن جان عالم نے ملکہ کے باپ سے کہا کہ "میں اپنا وعدہ پورا کرنے کو حاضر ہوں۔" اس نے جواب دیا کہ "یہ تمہارا کرم ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں ہیں، تمہیں اپنی بات کا پاس ہے کہ ہم پر یہ احسان کرتے ہو۔ بسم اللہ۔ ملکہ کو اپنی کنیزوں میں شامل کر لو۔" بہر حال ملکہ مہر نگار کا جان عالم سے نکاح ہو گیا، انجمن آرا اور مہر نگار میں محبت اتنی بڑھی کہ شہزادے کو بھول گئیں، شہزادہ بھی دونوں کو برابر چاہتا تھا اور دونوں کا خیال رکھتا تھا۔

وزیر زادے کی نمک حرامی

کچھ دن شہزادہ وہاں رہا آخر وطن اور اہل وطن یاد آئے۔ دونوں بیویوں سے کہا کہ بہت دن یہاں رہ لیے، اب کوچ کرنا چاہیے۔ وہ دونوں تو اپنے میاں کی خوشی میں خوش تھیں، فوراً راضی ہو گئیں، پھر شہزادہ اپنے خسر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے اجازت مانگی وہ بزرگ جانتا تھا کہ شہزادہ ایک مدت سے اپنے ماں باپ اور عزیزوں سے دور ہے، وہ اس کی جدائی میں تڑپتے ہوں گے، اس لیے اس نے

روکنا مناسب نہ سمجھا۔

رخصت کی تیاری ہوئی، مہرنگار کا باپ تخت تاج چھوڑ فقیر بن جنگل میں آ بیٹھا تھا اور یادِ خدا میں زندگی گزارتا تھا لیکن رخصت کے وقت اس نے بیٹی کو اتنا سامان اور نقد روپیہ دیا کہ شہزادہ انجمن آرا کا جہیز بھول گیا۔ رخصت کے وقت وہ نیک بزرگ جان عالم سے بولا ”مجھ غریب کے پاس کچھ نہ تھا جو تیری خدمت میں پیش کر کے اپنا جی خوش کرتا، مگر ایک پتے کی بات بتاتا ہوں، اگر دھیان میں رکھو گے تو یہ قارون کے خزانے سے زیادہ کام آئے گا۔“ پھر الگ لے جا کے شہزادہ کو سمجھایا اور بار بار تاکید کی کہ یہ بات اپنے سگے بھائی کو نہ بتانا، اگر بتاؤ گے تو پچھتاؤ گے اور حضرت یوسف سے بھی زیادہ دکھ اٹھاؤ گے۔ ہر طرف نیک کم اور برے زیادہ ہیں۔ ہر طرف شیطان نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ کسی کو اپنا راز کہنا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ چپ رہنے میں بہتری ہے۔ حضرت آدم کے زمانے سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہے۔

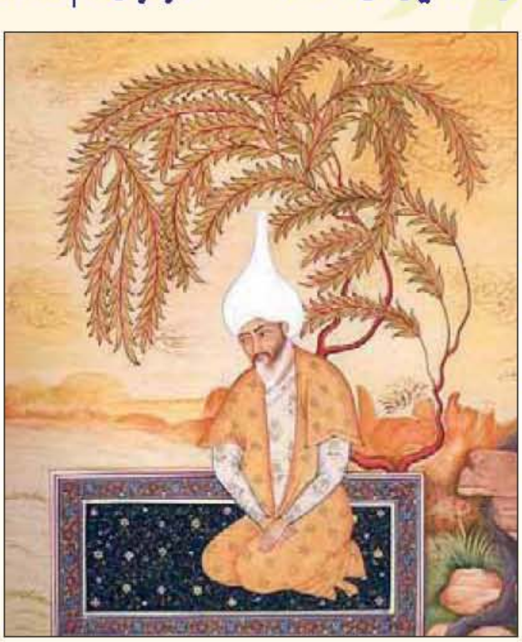

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

پھر وہ بزرگ انجمن آرا کے پاس آیا اور بولا ”شہزادی اپنی مہربانی سے اس فقیر زادی کو ساتھ لیے جاتی ہو تو اس کا خیال رکھنا۔ اس پر ہمیشہ کرم کی نظر رکھنا، یہ خدمت گزاری میں کسر نہ اٹھا رکھے گی، اسے تم کو سونپا اور تمھیں اس کو سونپا جس سے بڑا نگہبان کوئی نہیں لو، خدا حافظ۔“

دنیا میں ایسے ایسے اتفاقات ہو جاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وزیرزادہ جو شہزادے کے ساتھ وطن سے نکلا تھا اور ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈال کے بچھڑ گیا وہ مدتوں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اسی دن پھرتا پھراتا ادھر آ نکلا، اس نے جو یہ لاؤ لشکر دیکھا تو کسی سے پوچھا کہ یہ قافلہ کس کا ہے اور کہاں کی تیاری ہے۔

لوگوں نے وزیرزادے کو جان عالم کا سارا قصہ سنایا۔ یہ خوش ہوا، جان میں جان آئی پھر پوچھا کہ شہزادہ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ وہ دانا بزرگ کچھ سمجھانے اور نصیحت کرنے الگ لے گیا ہے۔

جب جان عالم بزرگ سے رخصت ہو کے سوار ہونے لگا تو یہ دوڑا اور آداب بجا لایا۔ شہزادے نے پہچانا اور گھوڑے سے کود کے بغل گیر ہو گیا۔ اسی دم اسے پوشاک پہنائی اور اپنے ہم راہ سوار کیا۔ راستے میں شہزادہ اپنے دوست سے سفر کا حال پوچھتا رہا۔ وہ بتاتا رہا۔ جب شہزادہ خیمے میں داخل ہوا تو وزیرزادے کو بھی وہیں طلب کیا۔ اس سے انجمن آرا اور ملکہ کو نذر دلوائی اور بولا ”یہ وہی شخص ہے جس کی جدائی سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ دیکھو جب اچھے دن آتے ہیں، بے تلاش بچھڑے مل جاتے ہیں۔ زمانے کی گردش نے ہمیں اپنے دوست سے جدا کر دیا تھا، آخر ملا بھی دیا۔“

اب وزیرزادے کے دل کا حال سنو، اس نے انجمن آرا کے حسن و جمال کو دیکھا تو دیوانہ ہو گیا، ہوش و حواس جاتے رہے، عقل کھو بیٹھا، دل میں دغا آئی، نمک حرامی پر کمر باندھی اور انجمن آرا کو حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ذرا دیر یہ صحبت رہی، پھر سب اپنے اپنے خیمے میں چلے گئے۔ وزیرزادے کے لیے ایک شاندار خیمہ کسا گیا، دونوں شہزادیوں کے ساتھ بہت سی حسین کنیزیں تھیں، وہ سب وزیرزادے کو دکھائی گئیں

کہ ان میں سے جو پسند ہو اس سے شادی کر لے۔ وہ نمک حرام تو اور ہی خیال میں تھا۔ بناوٹ سے بولا ''میری یہ کہاں مجال کہ آپ کی کسی کنیز سے شادی کرنے کا ارادہ کروں۔'' جان عالم اس جواب سے بہت خوش ہوا کہ وزیرزادہ ہمارا کتنا ادب کرتا ہے۔

شہزادے اور وزیرزادے میں ہر وقت ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ اس سے کوئی بھید نہ تھا مگر جب کبھی وزیرزادہ پوچھتا کہ ملکہ کے باپ نے الگ لے جا کے کیا نصیحت کی تھی وہ ٹال جاتا۔

ایک دن انجمن آرا اور مہر نگار میں آپس میں صلاح ہوئی اور پھر دونوں نے شہزادے سے عرض کیا کہ ''یہ بات کہاں تک مناسب ہے کہ ایک غیر شخص کو جو جوان بھی ہے اسے ہر وقت اپنی محفلوں میں شریک رکھا جائے، اس طرح حکومت کا رعب ختم ہونے کا بھی اندیشہ ہے، پھر یہ کہ شیطان کو کبھی دور نہ سمجھنا چاہئے اور غیر تو کیا اپنے پر بھی اعتماد نہ کرنا چاہیے۔''

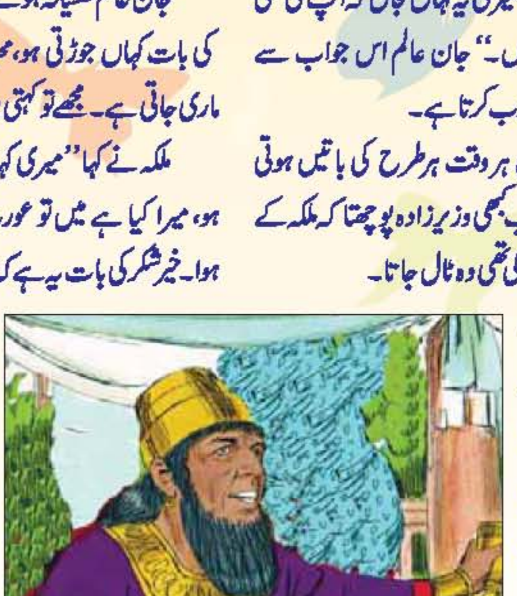

جان عالم نے غصہ سے کہا ''ایسی بات پھر کبھی زبان پر نہ لانا، اس نے تمہاری کسی کنیز تک کو قبول نہیں کیا، تمہیں کیا بری نظر سے دیکھے گا۔ پھر میں ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ بے سوچے سمجھے کسی پر بھروسہ کر لوں۔''

ملکہ سن کے ہنسی اور انجمن آرا سے مخاطب ہو کے بولی ''خدا کے لیے ذرا تم ہی انصاف کرو، شہزادے کی بے وقوفی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اگر یہ عقل کے دشمن نہ ہوتے تو بے سوچے سمجھے حوض میں کود کے جادوگرنی کی قید میں کیوں پھنستے۔ تم چپ کیوں ہو گئے، ذرا بولو۔ سچ کہو، شرماؤ مت تمہارے جی میں کیا آئی کہ جھپ سے حوض میں غوطہ مار دیا، یہ نہ سوچا کہ کہاں شہزادی انجمن آرا کہاں جنگل کا حوض، انجمن آرا نہ ہوئی جل پری یا پانی کی مچھلی ہو گئی۔''

جان عالم کھسیانہ ہو کے بولا ''کیا تمسخرا پن کرتی ہو، کہاں کی بات کی بات کہاں جوڑتی ہو، محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ مجھے تو کہتی ہو ذرا اپنی حماقتوں کا خیال کرو۔''

ملکہ نے کہا ''میری کہانی تو تم اپنی شرمندگی دور کرنے کو سناتے ہو، میرا کیا ہے میں تو عورت ذات ہوں، ذرا سی نادانی ہو گئی تو کیا ہوا۔ خیر شکر کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی عقل ایک سی ہی ہے۔''

اس طرح یہ بات ہنسی میں اڑ گئی مگر وہ مکار بدذات موقعے کے انتظار میں رہا۔ ایک دن جنگل میں لشکر نے خیمے ڈالے۔ موسم اچھا تھا، چاروں طرف ہریالی تھی، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کیے دے رہی تھی، شہزادے کے دل میں لہر آئی، وزیرزادے کا ہاتھ پکڑ کے اٹھا اور چشمے کے کنارے جا بیٹھا۔ شراب کا دور چلنے لگا، شراب کا بھی عجب حال ہے پینے والے کو اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں رہتا، جان عالم کو نشہ چڑھا تو وزیرزادے سے دوستی اور محبت کی باتیں کرنے لگا، وہ کم بخت تو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھا، رونے لگا۔

شہزادے نے ہنس کر کہا ''خیر تو ہے'' وہ نمک حرام بولا ''میں نے جان نثاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، ہمیشہ شہزادے پر جان و مال قربان کرنے کو حاضر رہا۔ آپ کی خاطر گھر بار چھوڑا اور جنگل کی خاک چھانی، انعام یہ ملا کہ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ ذرا سی بات اس خاکسار سے راز میں رکھتے ہیں۔''

جان عالم نے نشے کی ترنگ میں یہ نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے رونے سے بے چین ہو گیا بولا ''اگر یہ راز جاننا ہی چاہتا ہے تو سن، مجھے ملکہ کے باپ نے یہ ترکیب بتائی کہ جس بدن میں

چاہوں اپنی روح ڈال دوں۔"

اس نے پوچھا "یہ کس طرح؟"

شہزادے نے پوری ترکیب بتادی۔ جب وہ سیکھ چکا تو بولا" آزمائے بغیر مجھے یقین نہیں کہ ایسا ہوسکتا ہے۔"

شہزادہ اٹھ کے جنگل کی طرف چلا۔ ذرا دور جا کے دیکھا کہ ایک بندر مرا پڑا ہے کہا "دیکھ میں اس مردہ بندر کے جسم میں داخل ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کے شہزادہ زمین پر لیٹ گیا۔ بندر اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر زادہ ساری ترکیب سیکھ ہی چکا تھا۔ فوراً لیٹ گیا اور اپنی روح شہزادے کے بے جان بدن میں ڈال دی۔ پھر کمرے سے تلوار نکالی اور اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔

شہزادے کا نشہ ہرن ہوگیا مگر اب وہ شہزادہ کہاں تھا، بندر تھا، اپنے کیے پر بہت پچھتایا مگر اب کیا ہوسکتا تھا، اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری تھی، وزیرزادہ بندر کے پیچھے دوڑا، وہ بے چارہ بھاگ کر درختوں کے پتوں میں جا چھپا۔ وزیرزادے نے خود اپنے کپڑوں کو تار تار کیا، ان پر خون چھڑکا اور روتا پیٹتا خیمے میں پہونچا۔ وہاں سب کو یہ کہانی سنائی کہ "اس وقت بڑا غضب ہوا، میں وزیرزادے کے ساتھ سیر کرتا تھا، اچانک جنگل سے شیر نکلا اور اسے اٹھا کے لے گیا۔ میں نے تلوار سے اس پر حملہ کیا مگر اس بے چارے کو کسی طرح شیر کے پنجے سے چھڑا نہ سکا۔"

سب نے یہ سن کے افسوس کیا، ملکہ نے بھی سمجھایا کہ قسمت کے آگے کس کا بس چلا ہے۔ ہونی تو ہو کے ہی رہتی ہے۔

ذرا دیر بعد ملکہ انجمن آرا کے خیمے میں آئی، دیر تک وزیرزادے کی باتیں ہوتی رہیں۔ ملکہ تھی بہت ذہین اور بات کو تاڑنے والی کہنے لگی" خدا خیر کرے، آج برے شگون ہوئے تھے، صبح نماز کے وقت ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، ہرنی میرا راستہ کاٹ گئی تھی اور آج میری آنکھ بھی پھڑک رہی تھی۔ جب میں خیمے میں پہنچی تو کسی نے چھینک بھی دیا تھا۔ انجمن آرا، تم عقل کی پتلی ہو، یہ بتاؤ کہ یہ میرا وہم ہے یا آج شہزادے کی حرکتیں پہلے سے مختلف ہیں۔"

انجمن آرا نے جواب دیا "ملکہ تم تو جانتی ہو شہزادے کو وزیر زادے سے بہت محبت تھی، رنج بری بلا ہے آدمی بدحواس ہوجاتا ہے۔"

شہزادے کا دستور یہ تھا کہ ایک شام مہرنگار کے خیمے میں جاتا اور صبح تک وہیں رہتا۔ دوسری شام کو انجمن آرا کے خیمے میں اور رات وہیں گزار دیتا۔ اس حساب سے وہ شام ملکہ مہرنگار کے خیمے جانے کی تھی لیکن اس کی توجہ انجمن آرا کی طرف تھی۔ اس لیے اس کے خیمے میں چلا گیا۔ مہرنگار نے کافی دیر انتظار کیا۔ پھر انجمن آرا کے خیمے میں پہنچی۔ شہزادہ وہاں موجود تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ملکہ نے پوچھا" آج کہاں آرام کرنے کا ارادہ ہے؟" اس نے جواب دیا" جہاں تم کہو۔" ملکہ تاڑ گئی کہ یہ شہزادہ نہیں۔ اس سے کہا تم یہیں آرام کرو۔ اور انجمن آرا کا ہاتھ پکڑ کے اپنے خیمے میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کے بہت روئی پیٹی کہ "آج قسمت الٹ گئی، شہزادہ ہم سے بچھڑ گیا۔"

انجمن آرا نے کہا "صاف بتاؤ کیا بات ہے۔" ملکہ نے کہا "یہ

شہزادہ ہرگز نہیں ہے۔'' انجمن آرا نے بھی کہا کہ ''اس کی بہت سی باتیں بدلی ہوئی نظر آتی ہیں۔''

ملکہ نے کہا ''خیر اب جو ہو سو ہوا۔ آج رات تم یہیں سو رہو۔'' جشنوں اور ترکنوں کا حکم ہوا کہ ہم سوتے ہیں۔ تم مسلح ہو کر خیمے کے دروازے پر پہرہ دو اور شہزادہ تو کیا فرشتہ ادھر آئے تو اندر داخل نہ ہو سکے۔''

نقلی شہزادے نے جو یہ سنا تو ڈر کے انجمن آرا کے خیمے سے بھاگا اور کسی دوسرے خیمے میں جالیٹا۔ اب تو دونوں کو یقین ہو گیا کہ یہ اصلی شہزادہ نہیں۔ اگر شہزادہ ہوتا تو بے تکلف یہاں چلا آتا اور ہماری ناخوشی کا سبب پوچھتا۔ لیکن انجمن آرا کو یہ خیال ہوتا تھا کہ صورت تو بالکل وہی ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شہزادہ بدل گیا ہو۔

ملکہ نے اب اسے بتایا کہ ''میرے باپ نے رخصت کے وقت شہزادے کو الگ لے جا کے کچھ سمجھایا تھا، دراصل اس نے یہ ترکیب بتائی تھی کہ جب چاہو اپنی جان دوسرے جسم میں منتقل کر دو۔''

پھر ملکہ نے یہ بھی کہا کہ ''مجھے پہلے دن سے وزیر زادے پر شک تھا اور میں اس کے سامنے آنا نہ چاہتی تھی۔ شہزادہ نادان تھا میرا کہا نہ مانا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ شہزادے نے اس نمک حرام کو جسم بدلنے کی ترکیب بتادی ہے۔ اسی سے نقصان اٹھایا۔''

ساری رات دونوں سو نہ سکیں، بس باتیں کرتی رہیں۔ آخر دن نکل آیا۔ قافلے نے کوچ کیا۔ خبرداروں نے اس بنے ہوئے شہزادے سے عرض کیا کہ ''یہاں سے پانچ کوس فاصلے پر ایک شہر ہے۔ حاکم وہاں کا غضنفر شاہ زرہ پوش ہے۔'' حکم ہوا کہ شہر کے نزدیک پہنچ کے خیمے لگائے جائیں۔ قافلہ نزدیک پہنچا تو حکم کی تعمیل ہوئی۔ شہزادیاں ایک خیمے میں اتریں۔ یہ بھی وہاں پہنچا۔ وہ دونوں ڈری ہوئی تھیں۔ اس مکار کے دل میں بھی خوف تھا۔ ذرا دیر بیٹھ کر اٹھ گیا۔

وہاں کے بادشاہ نے سنا کہ زبردست لشکر شہر کے نزدیک آکے اترا ہے۔ بڑا فکر مند ہوا۔ وزیر کو تحفے دے کر بھیجا کہ لشکر میں جاؤ اور پتہ لگاؤ کہ کون ہے، کدھر سے آیا، کدھر کا ارادہ ہے اور سفر کا کیا مقصد ہے۔ یہ لشکر میں پہنچا۔ غرض بیگموں نے جعلی شہزادے کو خبر کی، وہ تو وزیر کا بیٹا تھا، سلطنت کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف تھا، وزیر کو اپنے پاس طلب کیا۔ بتایا کہ سیر اور شکار کے لیے ادھر آنکلے ہیں، یہاں کی آب و ہوا اچھی پائی اور اس شہر کے دیکھنے کو جی بے تاب ہوا تو یہاں اتر پڑے۔ وزیر نے اجازت چاہی تو نقلی شہزادے نے اسے خلعت و انعام دیا اور بادشاہ کے لیے کچھ تحفے عنایت کیے۔

وزیر نے اپنے بادشاہ سے اس کی بہت تعریف کی۔ اس کی شان و شوکت اور دبدبے کا ذکر کیا۔ بادشاہ کو اشتیاق ہوا اور خود ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ ادھر سے وزیر امیر بخشی پیشوائی کو گئے، بناوٹی شہزادہ خود استقبال کو در خیمہ تک آیا۔ بادشاہ اس سے کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ سب کو اپنا مہمان کیا۔ ایک عمدہ محل اس کے رہنے کو آراستہ کیا۔ دو محل سرائیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی دونوں شہزادیوں کے لیے خالی ہوئیں۔ یہ سب وہاں جا اترے۔ خوب دعوتیں اور مہمان داریاں ہوئیں۔

اس کے بعد کیسے ملکہ نے اندازہ لگایا کہ جان عالم دراصل ایک بندر بن گیا ہے اور بندر کو اپنی جان بچانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑا یہ پڑھیے اگلی قسط میں!

نورواحدی

آپ کو یاد ہوگا جون2014 میں 'بچوں کی دنیا' کی پہلی سال گرہ تھی۔نور واحدی صاحب نے کسی قدر دیر سے سہی، لیکن کچھ اتنے سلیقے اور استادی سے ایک نظم کہہ کر پہلی سال گرہ کے تحفے کے طور پر بھیجی ہے کہ ہم اسے آپ سے شیئر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔نظم ملاحظہ کیجیے اور نور صاحب کے فن کے قائل ہو جائیے۔ ن ظ

پیاری پیاری سالگرہ نیاری نیاری سالگرہ
'بچوں کی دنیا' کو مبارک پہلی پہلی سالگرہ
لے کر آئی سالگرہ بچوں کے حسیں رخ پر
رقص سرور
مضموں جس کے انجانے پڑھ کر سب ہیں دیوانے
اچھی اچھی ادبی کہانی اور معیاری افسانے
جیسے گھر کے بچوں کی دادی کے ہونٹوں پر
قصہ حور
اس کی نظمیں اور غزلیں جیسے کھنکتی ہو پائل
بچوں کا کیا ذکر کروں بوڑھوں کے دل ہیں گھائل
پڑھ کر جس کو امی اور ابو ہیں گھر پر
خوشی سے چور
درس کا سی پارہ کہیے فن کا مہ پارہ کہیے
اس 'بچوں کی دنیا' کو علم کا گہوارہ کہیے
اردو کے یہ موتی جیسے چاند کے دامن پر
بکھرے انگور
مہک جو اس کی پاتے ہیں بزم سخن سجاتے ہیں
خواجہ جی اکرام الدین کے پاؤں بھی رک سے جاتے ہیں
دیکھتے ہیں جب 'بچوں کی دنیا' کے حسیں تن پر
لباس نور

Mr Nurul Hasan Ansari Noor Wahidi Doman Pura Habba Distt Mau - 275101 UP

■ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

◆ بیوی: سنو جی، ڈاکٹر نے مجھے ایک مہینہ آرام کرنے کے لیے کسی خوب صورت ملک جانے کو کہا ہے۔ ہمیں کہاں جانا چاہیے؟

شوہر: دوسرے ڈاکٹر کے پاس!

محمد کاشف خورشید احمد، مالیگاؤں مہاراشٹر

◆ ایک شخص اپنا کتا ساتھ لے کر صبح کی سیر کو نکلا تو کسی نے پوچھا، ''کیوں بھئی اس گدھے کو کہاں لیے جا رہے ہو؟''

اس شخص نے کہا،'' اندھے ہو گیا۔ یہ گدھا نہیں کتا ہے۔''

دوسرے شخص نے کہا۔'' بھئی میں تم سے نہیں تمھارے کتے سے پوچھ رہا تھا!''

انھوں نے اپنا نام اور شہر نہیں لکھا

◆ سردی اور توہین جتنی زیادہ محسوس کرو گے اتنی ہی زیادہ لگے گی۔ اس لیے زندگی کا لطف لو۔ سوچو ہٹ کر۔ جیو ڈٹ کر!

◆ مریض: ڈاکٹر صاحب کیا دودھ پینے سے رنگ گورا ہوتا ہے؟

ڈاکٹر: ہاں۔ اس میں کیلشیم ہوتا ہے۔

مریض: تو پھر بھینس کا بچہ کالا کیوں ہوتا ہے؟

◆ پپّو نے کار لون پر لی۔ قرض نہ چکا پانے پر بنک والے کار اٹھا کر لے گئے۔ پپّو سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا، کاش میں نے شادی بھی لون لے کر ہی کی ہوتی!

◆ منّا: یار سرکٹ، یہ گاندھی جی ہر نوٹ میں ہنستے کیوں رہتے ہیں؟

سرکٹ: سمپل بات ہے۔ روئیں گے تو نوٹ گیلا ہو جائے گا!

◆ ایک گنجے کے سر پر دو بال تھے۔ دونوں میں پیار ہو گیا۔ لیکن ان کی شادی نہیں ہو سکی۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ بال وواہ غیر قانونی ہے!

◆ دنیا میں بس دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن کی دنیا دیوانی ہے۔ ایک :تاج محل۔ دوسرے: آپ...

...

...

نے مجھے تو دیکھا ہی ہوگا!

عفت ماریا، کامٹی

◆ ایک بھکاری نے ایک شخص سے بھیک مانگی تو اس نے ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بھکاری نے کہا،'' صاحب پہلے آپ مجھے دس روپے بھیک میں دیا کرتے تھے۔ پھر پانچ روپے دینے لگے۔ اس کے بعد دو روپے۔ اور اب صرف ایک روپیہ؟''

''بات یہ ہے میاں'' اس شخص نے کہا،''جب میں کنوارا تھا تو دس روپے دیتا تھا۔ پھر شادی ہو گئی تو بھیک گھٹا کر پانچ روپے کرنی

پڑی۔ شادی کے بعد ایک بچہ بھی ہو گیا تو دو روپے کر دیے۔ اور اب دوسرا بچہ ہونے والا ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے!" بھکاری بولا "آپ میرے پیسے سے اپنے گھر کا خرچ چلا رہے ہیں؟"

غلام مصطفیٰ رضوی، ناندیڑ، مہاراشٹر

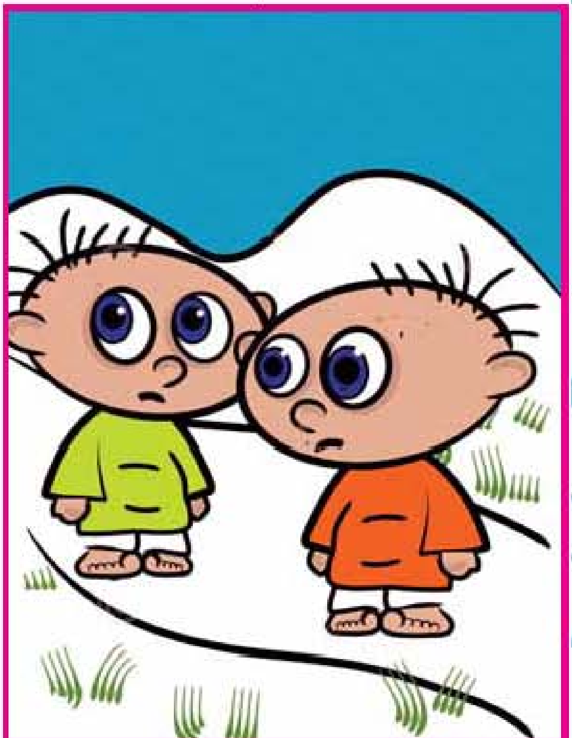

◆ بڑا بھائی: منا میں سوچ رہا ہوں کہ تمھیں دنیا کی سیر کرا لاؤں!

منا: لیکن بھائی اتنے سارے پیسے آپ کہاں سے لاؤ گے؟

بڑا بھائی: ارے بے وقوف، سوچنے میں پیسے کہاں لگتے ہیں!

محمد اویس شیخ، بیاول، مہاراشٹر

◆ داخلے کے لیے آئے ہوئے ایک بچے سے پرنسپل نے پوچھا۔ "بیٹا تمھارے والد کیا کام کرتے ہیں؟"

"جو بھی امی کہتی ہیں وہ کرتے ہیں۔" بچے نے کہا۔

ثنا فردوس، اورنگ آباد

◆ ٹریفک کا سپاہی سائیکل سوار سے: رک جاؤ۔ تمھاری سائیکل میں لائٹ نہیں ہے۔

سائیکل سوار: معاف کیجیے جناب ۔ میں رک نہیں سکتا۔ میری سائیکل میں بریک بھی نہیں ہیں!

محمد ناز، اورنگ آباد

◆ ہم جیتے ایک بار ہیں
ہم مرتے ایک بار ہیں
پیار بھی ایک بار ہوتا ہے
شادی بھی ایک بار ہوتی ہے
پھر یہ ایگزام بار بار کیوں ہوتے ہیں؟
جاگو اسٹوڈنٹس جاگو

نام پتہ نہیں لکھا

میں عربک پنجم (10) میں پڑھ رہا ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ ◆ دنیا کے مذہبوں کی جانکاری دے رہے ہیں جس کی مجھے بہت دنوں سے تلاش تھی۔ اردو الفاظ کا سلسلہ بھی اچھا ہے اس سے ہماری زبان میں سدھار آئے گا۔

صابر الیاس سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

◆ ایک شخص کو چاند پر بھیجا گیا مگر وہ بیچ راستے سے لوٹ آیا۔ وجہ پوچھی گئی تو بولا "مجھے بے وقوف سمجھا ہے کیا؟ کل اماوس ہے۔ جب میں پہنچوں گا تو وہاں چاند ہوگا ہی نہیں!

عبدالمنتقم، بشولا پور، مہاراشٹر

◆ لائبریری میں ایک صاحب دیر تک موٹی سی کتاب پڑھتے رہے۔ تین گھنٹے بعد کتاب رکھ کر لائبریرین سے بولے۔ "بھئی بڑی ہی بور کتاب ہے۔ اتنی بڑی کتاب، اتنے سارے کیریکٹر، پھر بھی کوئی کہانی نہیں!"

لائبریرین بولا "یہ ناول نہیں ٹیلیفون ڈائریکٹری ہے جناب!"

انھوں نے بھی اپنا نام پتہ اور شہر نہیں لکھا! ◻

سب سے پہلے این سی پی یو ایل کو 'بچوں کی دنیا' کا ایک سال پورا ہونے پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، وسیم بریلوی، نصرت ظہیر وغیرہ کو بھی مبارک باد جن کی محنت سے رنگ برنگے پھولوں سے سجا یہ گلدستہ بچوں تک ہر ماہ پہونچتا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کے لیے یہ شعر:

ماضی ہو مبارک تجھے یہ حال مبارک
اے بچوں کی دنیا تجھے یہ سال مبارک

'بچوں کی دنیا' کے کھٹے میٹھے ادب پارے کا انتظار بچوں کو ہر ماہ شدت اور بے صبری سے رہتا ہے۔ اس کے اندر ایک خط اور افسانے جیسی خصوصیت ہے۔ خط اس لیے کہ اس رسالہ کا سرورق اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتا ہے کہ پڑھنے والا سرورق دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیتا ہے کہ اندر کتنی دلچسپ کہانیاں، نظمیں، معلوماتی خبریں وغیرہ ہوں گی اور افسانہ اس لیے کہ ''بچوں کی دنیا'' ایک ہی نشست میں خود کو قاری سے پڑھوا لینے کی قوت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک اچھا افسانہ پڑھتے وقت یہ تجسس برقرار رہتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور یہی وہ تجسس ہے جو قاری کو ایک ہی نشست میں افسانہ ختم کرنے پر مجبور کرتا ہے بالکل اسی طرح اس رسالے میں ایک کہانی پڑھنے کے بعد یہ تجسس ہمیں آگے پڑھنے پر مجبور کرتا ہے کہ آئندہ صفحات میں اور کیسی دلچسپ کہانیاں، نظمیں و دیگر چیزیں ہوں گی۔ اس ماہ بھی یہ اپنی نئی آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا۔ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس سے نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی فیض یاب ہو رہے ہیں مثلاً ہر ماہ واقعات کے آئینے میں، اور مضامین وغیرہ یہ سب چیزیں بچوں اور بڑوں دونوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس ماہ کی کہانیاں، نظمیں، اردو ایس ایم ایس بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں۔ بہت سی خوبیوں سے مزین اس رسالے کی خدمت میں ایک شعر پیش ہے۔

ہم نے تو کیا اپنا فسانہ یہ تمام
لیکر کے جسے چھیڑا تھا اللہ کا نام
اب رب سے ہماری یہ دعا ہے مہوش
حاصل ہو تجھے اوج ثریا کا مقام

مہوش نور ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسیٹی، نئی دہلی

ماہنامہ بچوں کی دنیا جون 2014 دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بے پناہ مسرت حاصل ہوئی۔ یہ رسالہ صوری و معنوی ہر لحاظ سے خوب سے خوب تر ہے۔ اسے سجانے، سوارنے میں آپ جس طرح محنت اور جانفشانی سے کام لے رہے ہیں وہ یقیناً قابل مبارکباد اور لائق تحسین عمل ہے۔ بظاہر رسالہ بچوں کے نام سے موسوم ہے لیکن بچوں سے کہیں زیادہ نوجوانوں اور بزرگوں کے لیے کارآمد و مفید ہے۔ اس میں ایسے نادر و نایاب مضامین اور عمدہ تخلیقات اشاعت پزیر ہوتے ہیں جہاں تک ہر پڑھے لکھے انسان کی رسائی ممکین نہیں۔ رسالے کو پڑھنے والا عمر کے آخری حصہ میں ہی کیوں نہ پہونچ گیا ہو مگر اس کو یہ احساس ضرور ہوتا ہوگا کہ ابھی میں بچپنے کے دور سے گزر رہا ہوں یہی احساس دراصل آپ اور آپ کے رفقا کی تمام تر کاوشوں کے لیے بہترین خراج عقیدت ہے۔ رب کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ آپ تا دیر سلامت رہیں تا کہ نئی نسل کی ذہنی و اخلاقی رہنمائی ہوتی رہے۔

محمد شعیب جمیل قادری

متعلم مدرسہ حنفیہ ضیا القرآن شاہی مسجد بڑا چاند گنج لکھنؤ

محترم خواجہ اکرام الدین صاحب سب سے پہلے تو بچوں کا اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب رسالہ 'بچوں کی دنیا' جاری کرنے کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ بھلے ہی دیر سے سہی لیکن بہرحال آپ اور آپ کے ادارے کے احباب صدہا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں قومی اردو کونسل کے حوالے سے برابر بچوں کے لیے ایک معیاری رسالہ شائع کرنے کی وکالت کی تھی جس کے تحت اردو دنیا میں میرے مراسلے بھی شائع ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے ہندوستان میں بچوں کے ادب میں کسی بھی زبان میں نکلنے والا یہ پہلا رسالہ ہے جس نے بلامبالغہ سارے معیارات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس رسالے کو آپ نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے بہترین رسالوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' معنوی اور اصولی دونوں لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ ہے اس میں شامل مواد یوں تو سب ہی ایک سے ایک معیاری اعتبار لیے ہوئے ہیں۔ لیکن رسالے کے مدیر اعزازی نصرت ظہیر صاحب کا دنیا اور ہندوستان کے مذاہب پر معلوماتی سلسلہ بہت زبردست اور خاصہ کی چیز تھی۔ ابھی اس سلسلے میں انھوں نے کئی مذاہب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ادھر چار پانچ شماروں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ نصرت ظہیر صاحب کا یہ سلسلہ ادھورا رہ گیا۔ اس کو بیچ میں کیوں روک دیا گیا۔ کیا مدیر اعزازی صاحب کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا ہے اگر ایسا ہے تو کسی اور شخصیت سے باقی ماندہ مذاہب پر لکھوا کر شائع کیا جانا چاہئے تھا۔ یہ سلسلہ بچوں کی معلومات میں اضافے کا باعث اور اچھا تھا۔ اس طرح کی تحریروں سے بچوں کی معلومات اور دوسرے مذاہب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بہرکیف یہ میرا نظریہ ہے آپ کیا سوچتے ہیں وہ شاید زیادہ موزوں ہوگا۔ ایک بار پھر میری جانب سے آپ کو نائب مدیر صاحب، اعزازی مدیر صاحب اور آپ کے تمام ادارتی عملے کو بچوں کا اتنا خوبصورت رسالہ نکالنے کے لیے صدہا مبارکباد۔

محمد سراج عظیم

اے۔47، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

مدیرانِ محترم مارچ 2014 کا شمارہ طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ کے یوم پیدائش کی مناسبت سے بہت خوب رہا۔ آستانہ امیر خسروؒ کی تصویر اور آپؒ کی شبیہہ سے سرورق بہت جاذب نظر بن گیا ہے۔ ثمینہ پروین کا مقالہ بھی خوب ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔ ویسے 'بچوں کی دنیا' اب بچوں کی ہی نہیں بڑوں کی بھی دنیا ہوگیا ہے۔ میرے گھر کے سبھی لوگوں کو اس کا انتظار رہنے لگا ہے۔

ساحر کلیم

انڈین گیس ورک، نزد وجے ٹاکیز سلاد ضلع اورنگ آباد۔431112

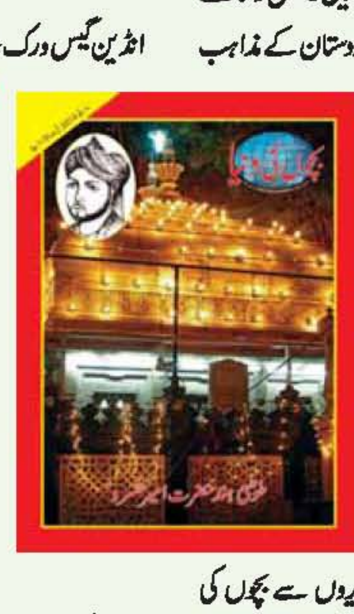

'بچوں کی دنیا' کے کچھ شمارے پڑھنے کو ملے۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ مختلف پھولوں سے آراستہ گل دستہ اردو ادب کے کم عمر شائقین کے لیے ترتیب دے کر آپ ایک کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ بہترین طباعت اور گٹ اپ۔ کارآمد مضامین سے لبریز اور بہت ہی کم قیمت کے ساتھ معیاری رسالہ اس کساد بازاری میں شائع کرنا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرا۔

حسن ساہو جرنلسٹ،

الحسنات، سیکٹر V، ہمدانیہ کالونی بے مینا، سری نگر۔190018 جموں کشمیر

کہتے ہیں سمندر کے ساحل پر ریت سے سے شبیہیں بنانے کا رواج مصر میں فرعونوں کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور آج پوری دنیا میں یہ شوق پھیلا ہوا ہے اوپر بھی آپ ایسی ہی ایک شبیہ دیکھ سکتے ہیں جو جدید آرٹ کا نمونہ ہے اور جس میں گویا ایک آسمانی ہاتھ انسانی چہرے کو کچل رہا ہے▲

▲راستوں کی بھول بھلیاں ۔یعنی: نکلیں گے کہاں جانے کے لیے پہنچیں گے کہاں معلوم نہیں!!

▲بھلا یہ ممکن ہے کہ بی مانو کے سامنے سے کوئی چوہا منہ میں کچھ بھی دبا کر یوں ہی صحیح سلامت نکل جائے؟

Back Inner Cover

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ اوّل)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 453
قیمت: -/151 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 454 تا 896
قیمت: -/140 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 750
قیمت: -/243 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد سوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 710
قیمت: 235 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد چہارم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 875
قیمت: 279 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد پنجم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 428
قیمت: -/156 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خان
صفحات: 230
قیمت: -/106 روپے

علامہ فضل حق خیر آبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی
صفحات: 248
قیمت: -/91 روپے

تحقیق و تعارف

مصنف: حنیف نقوی
صفحات: 288
قیمت: -/99 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 354
قیمت: 118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 368
قیمت: 133 روپے

ہندوستانی تہذیب

مصنف: ابن کنول
صفحات: 399
قیمت: -/131 روپے

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری

مصنف: عبدالغنی مدہوش
صفحات: 192
قیمت: -/67 روپے

جدید دنیا میں تعلیم

مصنف: نیاز احمد اعظمی
صفحات: 179
قیمت: -/73 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/96 روپے

پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال

مترجم: سید ظفر الاسلام
صفحات: 78
قیمت: -/64 روپے

پیٹ کے کیڑے

مصنف: محمد رفیق اے ایس
صفحات: 79
قیمت: -/40 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل

مصنف: احمد کفیل
صفحات: 284
قیمت: -/104 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Front Inner Cover

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیَا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in